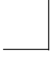
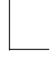
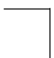
اسلام: مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید


اسلام

مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید

راشد شاز

ملی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۔ ۲۵

سال اشاعت ۲۰۰۸ء

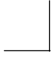
نام کتاب	:	اسلام: مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید
مصنف	:	راشد شاز
اشاعت	:	۲۰۰۸ء
قیمت	:	۱۵۰ روپے
مطبع	:	گلوریس آفسیٹ، نئی دہلی۔ ۲

ISBN: 81-87856-12-2

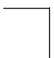
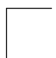
ناشر
ملی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

Tel:+91-11- 26946246, 26945499
Fax: +91-11-26945499
Email: militime@del3.vsnl.net.in

www.barizmedia.com




found.



قرآن مجید کو فقہی، شرعی یا مولویانہ انداز سے پڑھنے والوں نے کوئی پانچ سو آیات کو آیاتِ احکام کی حیثیت سے اپنے غور وفکر کا مستحق سمجھا تھا۔ اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہی گئی کہ یہ علوم جو بنیادی طور پر ان پانچ سو آیات کو اپنی توجہ کا مستحق سمجھتے تھے، اس نے وحی ربانی کے ایک بہت بڑے حصے کو عملی طور پر علوم شرعی کے دائرے سے باہر کر رکھا تھا۔ آیات اللہ فی الکون کے مطالعے اور مشاہدے کا علوم شرعی کے دائرے سے باہر ہوجانا ایک بحرانی عہد کی اجتہادی اور تعبیری لغزش تھی۔ جس نے آنے والی صدیوں میں امت کو تحقیق واکتشاف کے عمل سے دور کر دیا۔ آیت احکام کے علاوہ قرآن مجید کے ایک بڑے حصے کو عملی طور پر منجمد کئے جانے کے نتیجے میں آج ہم من حیث الامتہ منصب سیادت سے معزول ہوگئے ہیں۔

فہرست



قرآن مجید کا از سرِ نو کھولنا صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے لئے بھی ایک بڑا وقوعہ ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیغمبر کے غیاب میں کتاب کا کھلنا اپنے اندر بڑا اندیشہ رکھتا ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ خدا کی اسکیم یہی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب انسانی معاشرہ مجموعی طور پر اتنا بالغ ہو چکا ہے جہاں کسی پیغمبر کے غیاب میں بھی وہ وحی ربانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب خدا کوئی نبی نہ بھیجے گا۔ نبی کے غیاب میں خدا کی کتاب حجۃ من بعد الرسل کی حیثیت سے انسانوں کی رہنمائی کا کام انجام دیتی رہے گی۔

پیش لفظ

صدیوں سے روایتی مسلم ذہن جدالِ فقہی کی آماجگاہ ہے۔ امتِ مسلمہ کے درونِ خانہ مکالمے اس احساس سے خالی ہیں کہ وہ شہداءعلی الناس کے فریضہ پر مامور انسانی تاریخ کے آخری رسولؐ کی امت ہے۔ اس نظری دعوے کے باوجود کہ ہم خیر امت ہیں واقعہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی سیادت تو کجا بین الاقوامی سطح پر ہماری بے وزنی کے چرچے عام ہیں۔ جہاں دوسری قومیں مستقبل کے سلسلے میں مختلف منصوبے بنا رہی ہیں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے تابناک ماضی کے ورد سے صبح وشام کرتے ہیں جس سے کسی حد تک ہماری شکست وریخت کا نفسیاتی مداوا تو ہوجاتا ہے البتہ کسی نئی صبح کا کوئی امکان پیدا نہیں ہوتا۔ جدید دنیا میں سفر وحضر کی سہولتوں سے لے کر سر کائنات کی نقاب کشائی تک جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں ہمارا حصّہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایجادات واختراعات کی اس جگمگاتی دنیا کی جڑیں جس ماضی بعید میں پائی جاتی ہیں اس کی قیادت کبھی ہمارے ہاتھوں میں رہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ محض ماضی کے اس رومانی تذکرے سے مستقبل کی کمان ہمارے ہاتھوں میں نہیں آسکتی۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ اقوامِ عالم کے لئے منارۂ نور تھے وہ رفتہ رفتہ مسلم قومی خول میں کیسے محصور ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان کے درونِ خانہ مکالمے سے کـافۃللـنـاس کا تناظر جاتا رہا، بشیر ونذیر کا وصف ان کی شخصیت کا حصہ نہ رہا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے چھ بلین انسانوں پر سرمایہ داری کا خونخوار عفریت مسلط ہے۔ پوری دنیا ٹیکس کی جبری مشین میں کس دی گئی ہے اور یہ شکنجہ روز بروز سخت تر ہوتا جا رہا ہے۔ انسانوں کے لئے اس نظام سے باہر زندگی جینے کے امکانات تقریباً ختم ہوکر رہ گئے

ہیں۔ جمہوریت سرمایہ دار مجرموں کی پناہ گاہ بن گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مسلسل استحصال نے انسانوں سے آزادانہ غور وفکر کی صلاحیت سلب کر لی ہے گویا ہم ایک ایسی دنیا میں جینے پر مجبور ہیں جہاں نہ زندگی جاتی ہے اور نہ موت آتی ہے: ﴿لا یموت فیھا ولا یحی﴾۔

دینی علوم کی دانش گاہیں ایک ایسے نصاب کو جزوِ دین قرار دیئے بیٹھی ہیں جن پر صدیوں کی گرد جم چکی ہے۔ لین دین اور معاملات کے وہ تمام مسائل جو ان کتابوں میں بیان ہوئے ہیں یا فلکیات کا وہ علم جن کا ورد اب بھی وہاں جاری ہے ایک ایسی دنیا کی خبر دیتے ہیں جو عرصہ ہوا ہمارے اردگرد سے غائب ہوچکی ہے۔ حرام وحلال کے وہ تمام فروعات، نکاح وطلاق کی موشگافیاں اور تقسیم وراثت کی باریک بینیاں اب نئی بدلی ہوئی صورت حال میں، قدیم تدوینی طرزِ فکر کے ساتھ، عدل وقسط کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ ایسا اس لئے کہ خالص سرمایہ (Pure Capital) جس طرح سے اقوام عالم کی گردنوں پر شکنجہ کستا جارہا ہے اب اس کا سدّ باب زکوٰۃ کی روایتی تطبیق یا چیریٹی ٹیکس کے ذریعے نہیں ہوسکتا بالخصوص ایک ایسی صورتِ حال میں جہاں سرمایہ داروں کے خیراتی ادارے بھی سرمایہ داری کے نظری جواز اور اس کی آبیاری کا کام انجام دے رہے ہوں۔ نبی کریمؐ کا یہ فریضۂ منصبی ﴿ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم﴾ ان کے متبعین سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانوں کی گردنوں کو ان تمام بوجھ سے نجات دلانے کے لئے سامنے آئیں جسے عہدِ حاضر کے استحصالی نظام نے فرد پر ڈال رکھا ہے کہ اس کے بغیر ﴿کلمۃ اللہ ھی العلیا﴾ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ گویا درونِ خانہ مسلم مکالمے کی از سرِ نو ترتیب وتدوین کے بغیر اقوام عالم کی سیادت کا خیال محض ایک نظری اور نفسیاتی خوش فہمی کو ہوا دینا ہوگا۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مغرب کی وہ دانش گاہیں جنہیں آج ہم آکسفورڈ، کیمبرج اور سوبون کے نام سے جانتے ہیں، اپنی ابتدا میں شرعی علوم کی دانش گاہیں تھیں جن کا ابتدائی فریضہ عیسائی فکر کی تدوین وترتیب اور مناظرہ ومجادلہ کے لئے افرادِ کار کا پیدا کرنا تھا۔ البتہ عیسائی مولویوں کی ان دانش گاہوں کو آج فکری اور علمی سیادت میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ اس کے برعکس ازہر، زیتونیہ، دیوبند اور اس قبیل کی دوسری مسلم دانش گاہیں جو شرعی علوم کے حوالے سے قائم ہوئی تھیں وہ کسی ایسے ارتقائی عمل سے یکسر خالی رہیں۔ ہمارے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلم ذہن صدیوں سے آیاتِ احکام کو دین کا ماحصل سمجھ بیٹھا ہے۔ دین کا مکمل تصور اور آیاتِ اکتشاف کی دعوتِ تدبر وتفکر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ذہن اب بھی عہدِ وسطیٰ میں جیتا ہے جہاں بقول اس کے

قدماءغور وفکر کا سارا کام انجام دے چکے ہیں جس کے بعد نئے علماء کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ نئے پیش آمدہ مسائل میں قدماء کے اقوال تلاش کریں۔

یہ مضامین جومختلف اوقات میں مجلّہ فیوچراسلام کے لئے املا کرائے گئے تھے دراصل اس خیال سے غذا حاصل کرتے ہیں کہ جب وحیِ ربّانی اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے تو ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کی فکر سے اپنا چراغ جلائے رکھنے کی کوشش کریں۔ پچھلے بھی ہماری طرح انسان تھے جنھوں نے اپنی عقل وفہم کے مطابق اس چشمۂ صافی سے اکتساب فیض کیا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے قرآن مجید پر جتنا حق ان کا تھا اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ پھر ہم خدا کی اس نعمتِ عظیم سے راست اکتساب کی کوشش کیوں نہ کریں۔ خدا جو ہم سے کہیں زیادہ ہماری کم مائیگی سے واقف ہے وہ خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی کتاب میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھیں: ﴿ افلا يتدبرون القران ... ﴾۔ خدا نے ہم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ ہم قدماء کے التباسات کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھریں۔

گذشتہ چودہ سو سالوں میں علوم کی جو ترقی ہوئی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوا ہے اس کے سبب قدماء کے مقابلے میں بعض رموزِ قرآنی ہم پر کہیں بہتر انداز سے منکشف ہوئے ہیں۔ رحمِ مادر کے تخلیقی عمل کو چھوڑیئے جس کی باریک بیں تفصیلات اہلِ فکر کے لئے مسلسل قبولِ اسلام کا سبب بنتی رہی ہے، ابھی تو امکانات کا ایک وسیع سمندر ہے جس سے سِرّیت کے نقاب کا اٹھنا باقی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں وقت کے حوالے سے الف سنة اور خمسين الف کے بیانات میں قدماء کو تطبیق دینے میں کافی دشواریوں کا سامنا تھا البتہ اب وقت کے linear اور circular تصورات کو تمام تر ابعاد کا ماحصل نہ سمجھا جانا اس خیال سے عبارت ہے کہ وقت ملٹی ڈائمنشل سے بھی آگے کی چیز ہے جس کا مکمل ادراک لاتسبوا الدهر کی روایتی تفہیم سے نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح چار سے زائد ممکنہ ابعاد کی بحث نے جہاں ایک طرف فضا (space) کے سلسلے میں نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے وہیں اس خیال نے فرشتوں، جنوں اور دوسری غیر مرئی مخلوقات کے سلسلے میں بھی ہمارے تصورات کو مہمیز کیا ہے جس کے سبب سورہ نجم کی وہ آیات جو اب تک صوفیاء کی فکری جولانیوں کا مرکز تھیں اب بڑی حد تک خالص سائنسی فکر کا استعارہ بن گئی ہیں۔ کائنات جیسی کہ وہ ہے کم از کم اہلِ ایمان کے لئے معمہ نہیں کہ وہ قرآنی بیانات کے مطابق عدم سے وجود میں لائی گئی اور اب ہر لحہ نمو کے عمل سے دوچار ہے۔ جہاں قدماء کے تعبیری اشارے کائنات کے

سلسلے میں موہوم تصورات سے عبارت تھے وہیں آج ناسا کے کیمرے اور ایسٹروفزکس کے علماء کروڑہا کروڑ کہکشاں کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا فرعون کا یہ سوال کہ ﴿ وما رب العالمین ﴾ اور پھر یہ جوابِ نبوی کہ ﴿ رب السموات والارض وما بینھما ﴾ اہل علم پر آج کہیں زیادہ رب کائنات کی ہیبت طاری کرنے کا باعث ہے۔ کل خدا کی کبریائی اور دعوتِ توحید کا انکار جتنا آسان تھا آج اتنا آسان نہیں شرط یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو قدماء کے ذہن سے پڑھنے کے بجائے اسے نئے دماغ سے اور نئی معلومات کی روشنی میں پڑھ سکیں۔

نیا مسلم دماغ قدیم کتابوں کے ورد سے تیار نہیں ہوسکتا۔ خدا کی کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب کو مستقبل کی کلید کے طور پر پڑھنا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے اور اس کتاب کے مصنف پر بھی۔ ہمیں دیر یا سویر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ قدماء کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ایک عدد دماغ سے نوازا ہے جس کا بنیادی فریضہ غور وفکر اور تدبر وتفکر ہے اور جس سے محض ٹوپی رکھنے کا کام لینا یا تربوش برداری کے لئے اسے استعمال کرنا کفرانِ نعمت، بلکہ بغاوت ہے۔ جب تک ہم پھر سے دل ودماغ کو حرکت میں نہیں لاتے اور وحیٔ ربّانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتے قدماء کے التسابات ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے اور ہم خود کو ایک ایسی صورتِ حال میں گھرا پائیں گے جسے قرآن ﴿ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ ﴾ سے تعبیر کرتا ہے۔

خدا کرے اس کتاب کی اشاعت سے نئے مسلم دل ودماغ کی تعمیر کا کام آسان ہو کہ ﴿ یوم لاینفع مال ولابنون الا ماأتی اللہ بقلب سلیم ﴾۔

راشد شاز

یکم جون ۲۰۰۸ء، نئی دہلی

۱

کیا اسلام کی ایک نئی تعبیر ممکن ہے؟

عرصہ ہوا مسلمان عہدِ مابعد (post-era) کا احساس لئے جیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم تاریخ کے ایک ایسے لمحے میں جی رہے ہوں جہاں اب قابل ذکر واقعات اور طرب انگیز حادثات کا ظہور بند ہوگیا ہو، ایک ایسی تاریخ جہاں سب کچھ پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکا ہو، جہاں آگے non-event کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، ایک ایسی خالی خولی تاریخ میں جہاں تمام کارنامے پچھلوں نے انجام دے ڈالے ہوں، حال اور مستقبل کے انسانوں کے لئے اس کے علاوہ اور کیا رول بچتا ہے کہ وہ پچھلوں کی تقدیس کا نغمہ گائے اور ان کی کامل اتباع وتقلید کو اپنا منتہا ومقصود قرار دے ڈالے۔

ماضی کی مدح سرائی صرف مسلمانوں کا قومی شعار نہیں، البتہ ہمارے یہاں اگر اس مسئلے نے ایک عارضہ کی شکل اختیار کر لی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہم ماضی کو تجربہ گاہ کے طور پر دیکھنے کے بجائے ایام تقدیس کا حامل سمجھتے ہیں۔ بہت کچھ مصیبت الفاظ واصطلاحات کی پیدا کردہ ہے جو بسا اوقات حقائق کے اظہار کے بجائے معانی کی ترسیل پر روک لگا دیتے ہیں یا کم از کم اتنا تو ضرور کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ذہنی شعور کو کسی قدر ان ہی مسلمات کا تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا ناقدانہ تحلیل و تجزیہ ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ مغرب میں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار کو سمجھنے کے لئے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح، روشن خیالی، صنعتی

انقلاب، جدیدیت اور اب مابعدجدیدیت کی جو اصطلاحیں کھلے عام استعمال ہوتی ہیں ان کو جوں کا توں قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پچھلوں کی عطا کردہ دانش کے معروضی مطالعے کے اہل نہیں رہ گئے ہیں۔ ایسا اس لئے کہ اصطلاحوں کا یہ بوجھ اپنے عہد کے مقبول عام ذہنی رویے اور سطح آب پر پائے جانے والی فکر کا اعلامیہ تو ضرور ہوتا ہے البتہ زیر آب پائے جانے والی فکران اصطلاحوں سے باہر رہ جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اہل فکر کی اس تاریخی درجہ بندی کو جوں کا توں قبول کرنا اس بات کا بھی اعلان ہے کہ ہماری فکران کے ذہنی ساخت اور تاریخی شعور کا تابع ومحمل ہوکر رہ گئی ہے۔ فی زمانہ ہمارا فکری افق اتنا پیچیدہ گوناگوں اور متضاد تصورات کی آماجگاہ ہے کہ کوئی ایک غالب اصطلاح اس کے اظہار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مغرب میں مابعد لاحقے کا فیشن دراصل اس بات کا غماز ہے کہ آگے جو کچھ ہے ان کی تشریح وتعبیر کا کام کسی ایک اصطلاح یا اصطلاحات کے مجموعے سے ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر Post-Modernism کے مسئلے کو لیجئے یہ ایک ایسی chaotic صورتحال کا بیان ہے جہاں انسانی اعمال کو کسی مسلمہ قدر کی بنیاد پر پرکھنا مشکل ہوگیا ہو۔ مثال کے طور پر مردانہ وجاہت جو کبھی جنگی معرکوں، شجاعت کی داستانوں اور انسانی حوصلے کی رہین منت سمجھے جاتے ہیں اور جہاں کہیں فٹ بال اور ہاکی کے کھلاڑیوں کو ان کی شاندار کارکردگی پر قابل مبارکباد سمجھا جاتا تھا اب wonder drugs یا inhancing pills کے استعمال نے ان کی رومانیت کے غبارے سے ہوا نکال دی ہے۔ مغرب کی ثقافتی زندگی میں (جس کے اثرات سے اب مشرق بھی نہیں بچا ہے) technology نے جو اودھم مچائی ہے اس نے انسان کی انفرادی زندگی کو تہہ وبالا کردیا ہے۔ بیسویں صدی کی شاعری پر جن لوگوں کی نظر ہے اور جو مغرب کے موجودہ ثقافتی افق سے بھی واقف ہیں ان کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ Waste Land کا نوحہ اور Proofrock کے اظہار عشق کے مقابلے میں اب ہمیں ایک ایسی دنیا سے سابقہ ہے جو بنیادی طور پر مطلقہ عورتوں اور hookups کی دنیا ہے جہاں کسی کو نہیں معلوم کہ مردوزن کے مابین تعلق کے لئے مروجہ دستور ہے کیا؟ اگر ایک طرف i-pod اور cellphone نے شخصی آزادی کے نئے افق پیش کئے ہیں تو دوسری طرف ان جدید آلات نے فرد کو introvert اور تنہا بنا دیا ہے۔ internet کی دنیا میں بظاہر تو کروڑوں لوگ ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ہر فرد ایک مہیب خوفناک جزیرہ بن گیا ہے۔ جب اہل مغرب اس ہیجان انگیز صورتحال کو Post-Modernism کا نام دیتے ہیں تو ان کے ذھن میں کہیں نہ کہیں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ جدیدیت کی منطقی منزل ہے، ہمارے تہذیبی سفر کا

تلچھٹ (by-product) ہے۔

مغرب میں زندگی کی بے سمتی اور معنویت کے فقدان کے نتیجے میں اگر ایک طرح کی مابعدیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور بعض مفکرین برملا یہ کہنے لگے ہیں کہ تاریخ کا سفراب اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے تو اس کی وجہ ثقافتی زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت اور بڑے پیمانے پر بے رنگ امریکی ثقافت کی رنگارنگی اور اس کا ہیبت ناک غلبہ ہے۔ مغرب کے ادب ،نغموں اور مصوری میں اس اکتا دینے والی یکسانیت کا خاصا شور وغوغا پایا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا فطری آبشار خشک ہو چکا ہو۔ فرد جو اب محض ایک صارف ہے اپنے اردگرد بے معنیٰ سرگرمیوں کا ظہور دیکھتا ہے۔ ایجادات و اختراعات کے نت نئے تماشوں کے باوجود وہ اپنے لئے تخلیق وتخیل کا امکان کم ہی پاتا ہے۔ہفت روزہ تعطیل کے سلسلے میں غیر معمولی جوش وخروش کا پایا جانا اور پھر سموار کی صبح کے خیال سے ذھنی تشنج کا شکار ہونا مغرب میں عوامی نغموں کا خاص موضوع رہا ہے۔ ہفتہ کے پانچ دنوں ڈراموں کے کردار کی طرح متحرک رہنا، وہ کچھ کئے جانا جس کے لئے فطری طور پر کام کرنے والوں میں داعیہ نہ ہو، اسی بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ایک بامعنی ، پرسکون زندگی جینا پچھلوں کا حصہ تھا۔ ہمارے حصے میں زندگی کی جو تلچھٹ آئی ہے اس میں فطری واقعات، اصلی کارناموں اور روحانی مسرت کا کوئی حصہ نہیں۔

مغرب کے مقابلے میں عالم اسلام کا نوحہ قدرے مختلف ہے جہاں مابعدیت کا احساس برق رفتار بے سمتی کے بجائے خوابیدہ سکون کا نتیجہ ہے۔ ابتدائے عہد میں جب مسلمانوں کے یہاں عقائد پر زوروشور سے گفتگو جاری تھی فقہاء ومتکلمین ،سبیل المؤمنین یا mainstream Islam (مقبول عام اسلام) کی تشریح وتعبیر میں مصروف تھے اور جب ان کے لئے ایک مقبول عام قالب کی تشکیل کا کام کچھ آسان نہ تھا، انھوں نے ضروری سمجھا کہ ابتدائی عہد کے آثار و ایام کو مستند تعبیری منہج کے طور پر قبول کرلیں۔ اگر بات قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ تک محدود رہتی تو ان دو بنیادوں پر اگلوں کے لئے بھی اپنی اپنی تعبیر کی گنجائش باقی رہتی اور یہ ممکن ہوتا کہ آنے والی نسلیں بھی آسمانی پیغام کو اسی زندہ خلاقانہ رویے کے ساتھ قبول کرتیں جیسا کہ پچھلوں نے کیا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو پچھلوں کی تفہیم اگلوں کے لئے معاون ہوتی مزاحم نہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ابتدائی صدیوں میں کلامی فلسفیانہ اور ادیانِ سابقہ کے فقہی مناہج کے زیر اثر عقائد پر ہونے والی موشگافیوں نے جو بحرانی کیفیت پیدا کی اس نے اس وقت کے فقہاء ومتکلمین کو اسلام کے ایک مستند اور عوامی قالب کی تشکیل پر مجبور کردیا۔ مصیبت یہ ہوئی کہ اس پورے تعبیری عمل میں آثار وایام حتیٰ کہ اس عہد

کی ثقہ اور غیر ثقہ تمام روایتوں کو کسی قدر تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم جیسی روایتوں کے ذریعے یہ خیال عام ہوا کہ ابتدائی تین نسلیں اسلام کے حتمی قالب کی تشکیل میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔ رہے اگلے تو ان کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان تین نسلوں کے فکر و عمل پر اپنے تعبیری منہج کی بنیاد رکھیں۔ تین نسلوں کی تقدیس کا یہ فسانہ بنیادی طور پر اہل یہود کے تعبیری منہج سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا جہاں تنعیم، اموریم اور سبوریم کو دین یہود کی تعبیر میں فیصلہ کن اہمیت حاصل تھی۔ کچھ یہی تصور ہمارے تعبیری منہج میں در آیا۔ ہم نے بھی ان کی طرح صحابۂ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کو تقدس مآب نسلوں کی حیثیت سے اپنی تاریخ میں جگہ دے دی۔ اس بات کی طرف ہماری توجہ کم ہی گئی کہ کسی عہد یا نسل کی تقدیس کا تصور قرآنی نظامِ فکر سے متصادم تھا اور یہ کہ عہد رسولؐ ہو یا تابعین و تبع تابعین کا عہد، یہ ایام فکری اور عملی ہر دو اعتبار سے جانگسل جد و جہد سے عبارت تھے جہاں مخلص مسلمانوں کے جلو میں فتنہ پرور منافقین اپنی ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے مختلف سطحوں پر سرتوڑ جد و جہد کر رہے تھے۔ کبھی یہ ذہن مسلح بغاوت میں ظاہر ہوتا تو کبھی علمی سطح پر تراشیدہ روایتوں، منسوب الی الرسول اقوال، اسرائیلیات اور احبار و ربائی کے سابقہ تعبیری منہج کی شکل میں مخل ہوتا اور کبھی کلامی موشگافیوں کے زیر اثر ایسا محسوس ہوتا کہ خدا اور آخرت سے متعلق قرآنی بیانات تشنہ طلب رہ گئے ہیں۔ ایک ایسی فضا میں ابتدائی نسلوں پر تکیہ کرنے سے ایک عوامی اسلام کے خد و خال متعین کرنے میں تو یقیناً بڑی مدد ملی البتہ اس ذہنی رویے نے آنے والے دنوں میں خلاقانہ طرزِ فکر کے تمام راستے بند کر دیئے۔ رفتہ رفتہ پیغمبرانہ اسلام کے بجائے اسلام کے ایک تاریخی قالب کو الاسلام کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔

قرآنی نظامِ فکر کے مطابق دین اسلام کی مبادیات اور اس کے خد و خال کی تشکیل کا کام عین حیات نبویؐ میں انجام پا چکا تھا: ﴿ الیوم اکملت لکم دینکم ﴾ یہی وہ ایام تھے جب وحی ربانی اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اسوۂ رسولؐ میں متشکل ہو گئی تھی۔ عہد رسولؐ میں اسلام کا جو بنیادی قالب وجود میں آیا تھا اس کی حیثیت قیامت تک متبعین محمدؐ کی تمام نسلوں کے لئے ایک لازمی اسوہ کی ہے۔ ہر عہد میں زمانی اور مکانی تبدیلیوں کے پیش نظر اس قالب کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں البتہ یہ اپنی اصل میں اس ابتدائی قالب سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہد صدیقی کا اسلامی قالب عہد رسولؐ سے قدرے مختلف متشکل ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ عہد فاروقی کا اسلامی قالب اپنے پیش رووں کے قائم کردہ نظائر سے برملا اختلاف کرے۔ البتہ اپنی اصل میں ان تمام قالبوں میں پیغمبرانہ اسلام کی وہی روح کارفرما نظر آئے

گی۔ جس طرح زمان ومکان کی تبدیلی کی وجہ سے عہد فاروقی میں نظائر محمدیؐ اور نظائر صدیقیؓ کو خیر باد کہتے ہوئے الگ نظائر کے قیام کی ضرورت پیش آئی اسی طرح آنے والی نسلوں کو بھی یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ بنیادی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے عہد کے لئے اپنے نظائر خود دریافت کریں۔ اس کے برعکس اگر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ پچھلوں نے جو کچھ کیا وہ فہم دین کا آخری پتھر ہے یا اسے کسی درجے میں تقدس حاصل ہے تو ہم دین اسلام کی پیروی کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں کی پرستش پر خود کو مجبور پائیں گے۔

یہ خیال کہ دین مبین کی تشریح وتعبیر کا کام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انجام پاچکا ہے۔ بعض ان مفروضات پر قائم ہے جن کی اسلامی فکر میں سرے سے کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔ ذرا غور کیجئے تاریخ کی یہ تفہیم جو خلفائے اربعہ کو خلفائے راشدون قرار دیتی ہے اور جس پر سنی اسلام کی عمارت قائم ہے آخر اس بات کا اسلامی عقیدے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ اسی طرح فقہائے اربعہ کے معاملے کو لیجئے جو خالصتاً تاریخی عمل کی پیداوار ہیں ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کسی کے ایمان پر کیسے حرف آسکتا ہے؟ یا آثار وایام کی وہ کتابیں جنھیں ہماری سماجی تاریخ کے بعض لمحات میں بوجوہ خصوصی اعتبار حاصل ہوگیا بھلا ان کو قبول کرنے یا نہ کرنے سے خدا اور اس کے رسولؐ سے ہماری وابستگی کیسے متاثر ہوسکتی ہے؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم ان قضیوں کو عقائد ومعتقدات کے دفتر سے خارج کردیں تو سنی اسلام کی عمارت زمین بوس ہوجاتی ہے۔ کچھ یہی حال شیعہ اسلام کا بھی ہے جہاں ائمہ معصومین کا سلسلہ، روایتوں کی ترتیب وتدوین کا کام، خلیفہ بلافصل کا عقیدہ عہد رسولؐ کے بہت بعد وجود میں آیا۔ اگر ہم تاریخی عمل کی بساط لپیٹ سکیں اور ہمارے لئے اسلام کے بنیادی قالب تک رسائی ممکن ہوسکے تو شیعہ، سنی اور ان جیسے اسلام کے مختلف قالب سے نجات کی راہ نکل سکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں امت مسلمہ ان بے سمت کارِ لایعنی سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہے جس نے عرصہ ہائے دراز سے اسے مسرت آمیز تخلیقی عمل سے محروم کر رکھا ہے۔ اس نکتے کو میں چند مثالوں سے واضح کروں گا۔

عرصہ ہائے دراز سے ہم ایک ایسے اسلام کے نقیب رہے ہیں جہاں ہم جیسے تاریخی انسانوں نے تعبیر کا حتمی کام انجام دے ڈالا ہے۔ تاریخ کے مستند قالب کی تشکیل ان کے ذریعے جلوہ گر ہوچکی ہے لہٰذا ہمارے لئے اب کرنے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ اگر ائمہ اربعہ غور وفکر کا تمام کام انجام دے چکے اور اگر صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کی تین نسلوں کو تقدیسی ایام (Canon Period) کا مرتبہ حاصل ہے تو

ہمارے لئے ان کی راہوں سے الگ اپنے عہد کے لئے اپنے نظائر کی تعمیر کا کام ممکن نہیں ہوسکتا۔ خدا کا یہ مطالبہ: ﴿افلایتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفاله﴾ اور دوسری طرف متوارث اسلام کا یہ اصرار کہ اسلاف کے فہم سے الگ کسی فہم کو اعتبار نہیں مل سکتا ہمیں ایک ایسی دنیا میں محبوس کردیتا ہے جہاں واقعات وحوادث نے جنم لینا بند کردیا ہو، جہاں تاریخ کے تمام واقعات صدیوں پہلے انجام پاچکے ہوں اور ہمارے ہاتھ خالی خولی بے معنیٰ ایام کے علاوہ کچھ بھی نہ آیا ہو۔

ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں تکلف سے کام نہیں لینا چاہئے کہ اسلام کے انبیائی قالب کی بنیاد پر ایک عالمی معاشرہ کا قیام ابھی باقی ہے۔ محمد رسول اللہؐ نے وحدتِ انسانیت، اکرامِ آدمیت اور توحید خالص پر مبنی جس انقلاب کا بٹن دبایا تھا اس کی منتہا ومعراج کا کھلے عام مشاہدہ ابھی باقی ہے۔ منصبِ رحمۃ للعالمینی کی یہی وہ معنویت ہے جس کی تکمیل کا کام آنے والی تاریخ میں متبعین محمدؐ کو انجام دینا ہے۔ گویا کہہ لیجئے کہ عہد صدیقی سے لے کر اب تک زمانی اور مکانی طور پر اسلام کے جن مختلف قالب کا ظہور ہوتا رہا ہے ان کی حیثیت ایک ارتقائی اور تدریجی عمل کی ہے جس کے حتمی اور منطقی منزل کے بعد تاریخ اپنی معنویت کھودے گی۔ کائنات کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

ان بیانات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مستقبل کا اسلامی قالب عہد صدیقی یا عہد فاروقی کے اسلامی قالب سے اوفق ہوگا۔ ان تمام قالبوں میں اصولی طور پر تو کوئی اختلاف نہ ہوگا البتہ آنے والے دنوں میں تمدن اور technology کی بہتر سہولتوں کے سبب اس نبوی قالب کو logistically کہیں بہتر طور پر برتا جاسکے گا۔ نبوی انقلاب کو اس کے حتمی اور منطقی انجام تک پہنچانے کا کام ابھی باقی ہے۔ جس طرح پچھلی نسلوں نے اس کام میں اپنا حصہ ڈالا تھا اسی طرح ہر آنے والی نسل کو اس مہم میں اپنی قوت وتوفیق کے مطابق لازماً شریک ہونا تھا لیکن ہوا یہ کہ اسلام کا ایک canonized version وجود میں آجانے سے وحی ربانی پر تخلیقی غوروفکر کا سلسلہ یکسر موقوف ہوگیا۔ وحی کے بجائے وحی کی انسانی تعبیرات ہمارا مقدر بن گئیں۔ non-event کے ان ایام میں ہمارا کام صرف یہ طے پایا کہ ہم مہدیٔ منتظر یا امام غائب کی راہ تکا کریں جس کی آمد سے ایک بار پھر ہماری زندگیوں میں عظیم واقعات کی ظہور پذیری کا سلسلہ چل نکلے گا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسیح کی آمد ثانی یا مسیحا کی آمد کے توہمات سے عیسائی اور یہودی قومیں بھی خالی نہیں۔ اہلِ کتاب جب تک ان توہمات کے زیر اثر انتظار کی گھڑیاں گنتے رہے دنیا کے مرکزی اسٹیج پر انھیں کوئی مقام حاصل نہ ہوسکا، البتہ جب اکتشافی علوم کے زیر اثر ان کا روایتی مذہبی ذہن متزلزل ہونے

لگا اور ان کی متعدد بہ تعداد نے فکر وعمل کی نئی راہیں اختیار کیں تو انھیں دنیا میں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی۔ کاش کہ اہل یقین نے تخلیقی ذہن کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج انسانیت کو موجودہ بے سمتی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہودی اور عیسائی قومیں مذہب کے نام پر رسومِ دینداری کو اپنا حرز جاں بنائے ہوئے تھیں۔ ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ نئے بدلتے ماحول میں نیا راستہ اختیار کرتے کہ ان کے یہاں قدماء اور اساطین مذاہب پر تنقید فی نفسہ مذہب سے بغاوت پر محمول کی جاتی تھی۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مسلمان جنھیں احبار ورہبان کی اتباع سے باز رہنے کی تاکید کی گئی تھی اور جنھیں آباء پرستی یا اسلاف پرستی سے لازماً اجتناب کرنا تھا ان کے یہاں بھی غیر خلاقانہ جامد تقلیدی رویے کو گہری مذہبیت کا علامیہ سمجھا جانے لگا۔

وحی ربانی کے بجائے ابتدائی تین نسلوں کی فہم کو حتمی معیار قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مذہبی اور اجتماعی زندگی creative originality سے محروم ہوگئی۔ قرآن مجید کے مقابلے میں انسانی تعبیرات اور ثانوی مآخذ میں بھلا یہ قوت کہاں ہوسکتی تھی کہ وہ زمان ومکان کی تبدیلی کا ساتھ دے سکے۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا رہا لیکن امت مسلمہ کی مذہبی فکر اور ذہنی ساخت عہد وسطیٰ کی تعبیرات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بدلی ہوئی اجنبی دنیا میں متوارث اسلام کے فکری سرمائے نے بسا اوقات مضحکہ خیز صورتحال کو جنم دیا۔ سچ پوچھئے تو ہماری پوری اجتماعی زندگی پر ایک طرح کے Pastiche کا گمان ہونے لگا۔ دینی زندگی کے مظاہر تو موجود تھے۔ مسلمانوں میں اتباعِ سنت کا ذوق وشوق بھی پایا جاتا تھا لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری جلت پھرت روح سے خالی ہوچکی ہے۔ ثانوی مآخذ اسلام کی نقل یا کاپی پیدا کرسکتے تھے کہ تازہ بہ تازہ اصل اسلام تک رسائی کے لئے لازم تھا کہ ہم اپنے حالات کے مطابق وحی ربانی سے راست اکتساب کرتے۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے فکری سرمائے پر نظر ڈالئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ان ضخیم مجلدات میں ایک ہی خیال کی مختلف اسالیب میں آبیاری کی گئی ہے۔ فقہاء کے لامتناہی دواوین، فتاؤوں کی ضخیم مجلدات، کتب روایات کی تخریج وتنقید اور ان پر حواشی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، ایک تفسیر کے بعد اسی خیال کی تائید وتوثیق میں مزید تفسیروں کی تالیف، مشہور کتابوں کی تلخیص اور پھر تلخیصات کی عقدہ کشائی کے لئے مختلف شرحوں کا وجود میں آجانا یہ سب کچھ اسی لئے ممکن ہوسکا کہ ہم ابتدائی عہد کے تقدیسی حصار کو توڑنے اور وحی ربانی سے راست رہنمائی کی اپنے اندر ہمت نہ پاتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان آج بھی اس گئی گزری حالت میں اسلام کو اپنے لئے نجات کی واحد راہ سمجھتے ہیں۔ ہماری مذہبی زندگی کی چہل پہل، عبادات کا ذوق وشوق، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی گرم بازاری

سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آج ہم بھی خدا کا احکام بجا لانے میں دوسری تمام قوموں پر سبقت رکھتے ہیں۔ لیکن حج کا عظیم اجتماع جو سفر کی سہولتوں کے سبب ہر سال مسلسل بڑھتا جاتا ہے، نماز اور روزے کے مظاہر جنھیں بعض تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کے سبب اس زمانے میں خاصا فروغ حاصل ہوا ہے یا جہاد کے وہ مظاہر جس پر کمال جانبازی کے ساتھ مسلم نوجوان مختلف ملکوں میں عامل ہیں۔ یہ سب کچھ نتائج کے اعتبار سے انتہائی مایوس کن ہیں۔ ہماری مذہبی اور اجتماعی زندگی اتنی بہت ساری جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود عہد رسولؐ جیسے نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ رسومِ دینداری کے یہ مظاہر اپنی اصل تخلیقی روح سے خالی ہیں۔ بظاہر تو مذہبی زندگی کا کاروبار زوروشور سے جاری ہے مگر فی الحقیقت ان کی حیثیت ڈرامے کے اسکرپٹ اور ان کے کرداروں سے زیادہ نہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لئے میں خطبۂ جمعہ کی ایک مثال پیش کروں گا جو ابتدائی ایام میں ایک مؤثر سماجی فورم کی حیثیت سے ہماری رہنمائی کا کام انجام دیتا تھا اور آج اس کی روح سلب ہوجانے کی وجہ سے غیر عرب ممالک میں خطبۂ جمعہ ایک پیروڈی بن کر رہ گیا ہے جہاں سامعین کو مقفّیٰ مسجعی عبارتوں میں ایسے بیانات سے ہر ہفتہ سابقہ پیش آتا ہے جو اس کی زندگی پر کوئی مثبت اثر تو کیا ڈالتے تضیع اوقات کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مثال پر مسلمانوں کی پوری مذہبی زندگی کو قیاس کیجئے جہاں بالکل اسی طرح زمان ومکاں اور سیاسی حقائق بدل جانے کے باوجود عہد سلاطین کے خطبے ہمیں امام عادل کی اتباع کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اگر ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا کہ ہم خطبے کی غایت کے پیش نظر، اسے عہد جدید میں مؤثر بنانے کے لئے، اسے وحی ربانی کی روشنی میں ازسرنو مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو یقیناً اس کے نتائج مختلف ہوتے۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم قدماء کے ذہن سے نئی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ بھلا جو لوگ صدیوں پہلے ایک بالکل ہی مختلف ماحول میں زندگی جیتے رہے، جنھیں اکیسویں صدی کی زندگی کا کچھ تجربہ نہ تھا انھیں نئی دنیا کی قیادت پر مامور کرنا ان کے اوپر بھی ظلم ہے اور ہمارے لئے بھی اس کے نتائج تباہ کن ہی ہوسکتے ہیں جب خدا کی تازہ بہ تازہ کتاب اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہو تو ہمیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ ہم اسے غور وفکر کا محور بنانے کے بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں سے مشکل کشائی کے طالب ہوں۔

اصولی طور پر ہمارے اہل خرد کے لئے یہ تسلیم کرنا شاید مشکل نہ ہو کہ قرآن مجید سے راست اکتساب ایک بار پھر ہماری خالی خولی non-event زندگیوں کو طرب انگیز سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا سکتا ہے۔ بہتوں کے لئے علمائے سلف کے تعبیری منہج کا تحلیل وتجزیہ ہوسکتا ہے شاید اجنبی خیال نہ ہو اور یہ بھی

ممکن ہے کہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر بعض حلقوں میں رسومِ دین داری کے بجائے غایت دین کی جوت جگانے کا داعیہ پہلے سے پایا جاتا ہو۔ جو امت گزشتہ کئی صدیوں سے ایک فکری راستے کی متلاشی ہو وہاں ان خیالات کو خوش آمدید کہنے والے بآسانی مل جائیں گے۔ البتہ عام لوگوں کے لئے یہ قبول کرنا کچھ آسان نہ ہوگا کہ قرآن مجید کو موجودہ سیاق وسباق میں پڑھنا ہمیں نئے نتائج اور نئے فیصلوں تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ اب تک جو لوگ تفسیر ماثورہ کے خوگر رہے ہیں یا جو متقدمین کے ذہن سے قرآن مجید کو پڑھنے کے عادی ہیں اور جن کے لئے قرآن مجید کے الفاظ میں معانی کی روح تعبیری حواشی کے ذریعے پھونکی جاتی رہی ہے ان کے لئے اس مروجہ منہج کو خیر باد کہنے کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے الفاظ راست ہم سے کلام کرنے لگے ہوں۔ منجمد الفاظ میں حیات افزا زندگی کا پیدا ہوجانا یقیناً ایک انبساط انگیز تجربہ ہوگا۔ یہ کچھ وہی صورت حال ہوگی جو کسی نئے نبی کی آمد آمد پر ہوتی ہے۔ اس عمل میں جہاں ایک طرف نئی حیات افزا زندگی کا مژدہ ہے وہیں ایک بڑا چیلنج بھی پوشیدہ ہے۔

قرآن مجید کو اکیسویں صدی کی کتاب ہدایت کے طور پر پڑھنے کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنے آپ کو عہد صدیقی اور عہدِ فاروقی کی طرح ایک ایسے اسلام کے جلو میں پائیں جس پر نہ تو پچھلوں کی التباسات فکری کا سایہ ہو اور نہ ہی کسی نئی صورتحال میں ہم آگے کا راستہ بند پاتے ہوں۔ فی زمانہ کتاب ہدایت سے ہمارے راست اکتساب کی کوشش قدماء کے بعض ان مسلمات کے سبب ممکن نہیں ہوتی جو قرآنی پیغام سے متصادم ہونے کے باوجود ہماری مقبول عام اسلامی فکر کا حصہ بن گئی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ﴿ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم﴾ کے قرآنی بیان کو پڑھتے ہیں تو ہمارا ذہن اس بیان کے قابل عمل ہونے کے بارے میں مخمصے کا شکار ہوجاتا ہے۔ اگر تقویٰ واقعی انسانوں کے فضل وشرف کا معیار ہے تو پھر الائمۃ من القریش جیسے فرمودات کے لئے کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔ ﴿کل نفس بما کسبت رھینہ﴾ ﴿لیس الانسان الا ماسعی﴾ اور ان جیسی دیگر آیات عز وشرف کی بنیاد کسبی عوامل پر رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مروجہ اسلام اس خیال کی پرزور تبلیغ کرتا ہے کہ کسی شخص کا کسی خاندان یا نسل میں پیدا ہوجانا ہی اسے شرف فضیلت سے سرفراز کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اہل بیت اور خصوصاً خانوادۂ علی کے سلسلے میں سنیوں میں نسبتاً کم اور شیعوں میں قدرے زیادہ فضیلت کے چرچے عام ہیں۔ قرآن مجید تو ﴿ماکان محمد اٰباء احد من الرجالکم ولکن رسول اللّٰہ﴾ کے بیان سے اس نکتے کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ محمد رسول اللہ کے خاندانی سلسلہ کا انقطاع ایک بڑی مصلحت کے پیش نظر ہے لیکن مروجہ اسلام اس بات

پر مصر ہے کہ امت آلِ رسولؐ کی خاندانی برتری کو تسلیم کرے اور ان کی تمام آنے والی نسلوں پر خواہ ان کے ذاتی اعمال جیسے بھی ہوں درود و سلام بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھے۔ قرآن کے منجمد الفاظ کو جسے مروجہ اسلام نے صدیوں سے خاموش کر رکھا ہے، اگر پھر سے بولنے کا موقع دیا گیا تو اس قسم کی نسل پرستی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کہا جاتا ہے کہ عہد فاطمی میں استحکام خلافت کے کوئی سو سال بعد جب عیدِ فاطمہ اور اس قبیل کی دیگر تقریبات کو سیاسی عوامل کے تحت فروغ دیا گیا اسی عہد میں آلِ رسولؐ کا موجودہ تصور بھی تشکیل پایا۔ عجب نہیں کہ اس قبیل کی دوسری دعائیں اور تسبیح فاطمہ اسی زمانے میں وجود میں آئی ہو۔

یہ تو تھی قدماء کی التباساتِ فکری سے باہر آنے کی ایک امکانی مثال۔ اب آیئے اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساتویں صدی میں نازل ہونے والی کتاب جب اکیسویں صدی میں خلاقانہ دل و دماغ اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ پڑھی جائے گی تو یہ عمل اپنے اندر کن اندیشوں اور امکانات کا حامل ہوگا۔ مثال کے طور پر آیت وراثت کو لیجئے جہاں بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو یک گونہ فوقیت حاصل ہے۔ ساتویں صدی کے پدرانہ عرب معاشرے میں جہاں عورت پر معاشی ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ نہ تھا، نان ونفقہ کی ذمہ داری سے وہ یکسر آزاد تھی، باپ، شوہر، بھائی اور قرابت کے مختلف رشتوں کے ذریعے اسے جو کچھ بھی ملتا اس کی حیثیت ایک جمع پونجی کی ہوتی۔ جبکہ مرد وارثین سماجی اور عائلی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے۔ ایک ایسے معاشرے میں وراثت کی یہ ترتیب عورت کے حق میں تھی۔ البتہ آج شہری زندگی میں بالخصوص مغرب کے بڑے شہروں میں جہاں عورت اور مرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں زندگی کا مکمل بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے وہاں باپ کے ترکے میں بیٹی کو مساوی حصے سے محروم کرنا ہوسکتا ہے سماجی انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو۔ جو لوگ حضرت عمر کے فہم انصاف سے واقف ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ آپ نے حالات کے بدل جانے کی وجہ سے سابقہ نظائر کو کس طرح بدل دیا حتیٰ کہ قطع ید کی قرآنی نص وقتی طور پر اس وجہ سے منجمد کردی گئی کہ قحط کے زمانے میں اس حد کا اطلاق قرینِ انصاف نہ تھا۔ اس کے برعکس جو لوگ اس بات پر اصرار کریں کہ فہم قرآن کے ہمارے نتائج متقدمین کی تعبیرات سے عین مطابق ہوں تو انھیں چاہئے کہ وہ اکیسویں صدی کی دنیا میں ساتویں صدی کا ماحول فراہم کریں کہ text کی معنویت اور اس کے اطلاقات context کے طابع ہوتے ہیں۔ اگر context بدل جائے تو text کے اطلاقات بھی لازماً بدل جائیں گے۔ قرآن کو موجودہ سیاق وسباق میں پڑھنا امکانات کے ساتھ ساتھ اندیشوں کا بھی حامل ہے۔ وحی جیسی عظیم شیئے سے انسانی دل ودماغ کا رابطہ ایک بڑا چیلنج ہے۔ اس عمل میں غلطیوں کے

امکانات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن خدا جو ہم سے کہیں زیادہ ہماری کمزوریوں سے واقف ہے وہ اگر ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم قرآن مجید کے صفحات میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھیں تو ہمارے لئے اس چیلنج سے فرار کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی۔



کائنات، جیسی کہ اللہ نے پیدا کی ہے، اپنے اندر بے شمار اسرار و رموز کی حامل ہے۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور اسی بارش سے اس سرزمین پر مختلف رنگوں کی فصلوں کا پیدا ہونا ایک ایسا مبہوت کر دینے والا عمل ہے جس پر غور و فکر انسان پر خشیت الٰہی طاری کر دیتی ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں اصل عالم کہا جاسکتا ہے: ﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف یہ فیصل کرنے بیٹھ گئے کہ دیگر قومیں جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ان کا کون سا عمل شریعت میں مباح ہے اور کون سا حرام؟ یا یہ کہ ان کی کن ایجادات کو لائق استعمال قرار دیا جاسکتا ہے اور کون سی ایجاد پر عدم جواز کا فتویٰ چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ تو یہ ذہنی رویہ ہمیشہ ہمیں محض ان کے تعاقب میں مشغول رکھے گا اور ہم کبھی اس لائق نہیں ہوسکیں گے کہ دنیا ہماری اتباع اور اقتداء میں چلے۔

۲

عقل بنام فتویٰ

اگر دودھ میں اس درجہ ابال آ گیا ہو کہ اس کے گر کر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں کیا سائل کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ فی الفور چولہے سے دودھ اتار لے جب کہ ایسا کرنے میں ہاتھ کے جل جانے یا ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ہاتھ کا جلنا نقصِ نفس سے عبارت ہے تو دودھ کا ضائع ہونا نقصِ مال پر مبنی ہے۔ایسی صورت میں کس نقصان کو اولیت دی جائے گی؟ اھون البلیتین کا فقہی اصول کیا کہتا ہے؟ لا ضرر و لا ضرار، المشقة تجلب التيسير جیسے معروف فقہی اصولوں کی روشنی میں سائل کے لئے مال اور نفس کے مابین کسے ترجیح دینا قرینِ دین ہوگا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن پر کسی شرعی رہنمائی کے لئے فقہاء کو مزید معلومات درکار ہوگی۔ مثلاً یہ کہ سائل کی معاشی صورتحال کیا ہے؟ دودھ کی واقعی مقدار کیا ہے؟ کیا دودھ کا زیاں اس کی معاشی حیثیت پر اثر انداز ہوگا؟ کیا دودھ اس کی ملک ہے یا وہ ملازم کی حیثیت سے اس کا امین ہے جس کے سبب امانت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اس پر اضافی طور پر عائد ہوجاتی ہے؟ یہ اور اس قبیل کی بہت سی موشگافیاں اس سوال کو ایک فقہی سوال بنانے میں معاون ہوسکتی ہیں۔لیکن ہم دیکھتے ہیں عام زندگی میں عام مسلمان نفس اور مال کے مابین نقص کا یہ میزانیہ خود ہی طے کر لیتا ہے۔ کسی صاحب افتاء یا اہل شرع سے رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ انسان کے اندر in-built عقل فی الفور اس بات کا فیصلہ کر لیتی ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ کسی ایسے فیصلہ کے لئے جہاں دودھ کے گرنے

اور ہاتھ کے جلنے کے مابین چند ثانیہ کا فاصلہ بھی نہ ہو انسانی عقل بڑی سرعت کے ساتھ مناسب ترین فیصلہ لیتی اور اسے فی الفور منطبق کر دیتی ہے۔ جب یہ سب کچھ اللہ نے انسان کے لئے اتنا فطری بنایا ہے تو پھر آخر اس بات کی ضرورت کیوں محسوس کی جاتی ہے کہ مختلف امور پر اصحاب فتاویٰ سے رائے لی جائے اور عام انسان اپنی عقل کے بجائے دوسروں کی عقل پر انحصار کو لازم خیال کرے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہاتھ کا جلنا اور دودھ کے گرنے کے مابین کسی ایک نقصان کو قبول کرنے کا معاملہ امورِ دنیا سے متعلق ہے۔ دین کے معاملات میں عقل وفہم پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کے مغالطہ ہونے سے خود اہل فتاویٰ بھی خوب واقف ہیں۔

اس بات کے تو سبھی قائل ہیں کہ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تقسیم نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود اہل فتاویٰ اپنی قیل وقال کو دینی علوم پر محمول کرتے ہیں اور اس حوالے سے عام مسلمانوں سے اس بات کے طالب بھی ہوتے ہیں کہ وہ ان کے فتاویٰ یا آراء کو تقدیس کے ہالے میں گھرا دیکھیں۔ جب اسلام دین اور دنیا کی تفریق کا قائل نہیں تو پھر یہاں دینی یا دنیوی علوم کی تقسیم کا کوئی جواز ہے اور نہ ہی اس بات کی کوئی گنجائش کے انسانوں کا کوئی طبقہ اپنے آپ کو دینی علوم کا ماہر بتائے اور عام انسانوں کو دین کے حوالے سے اپنی اتباع کی دعوت دے۔ قرآن مجید میں دین اور دنیا کا لفظ ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ قرآنی تصورِ حیات میں تو دنیا اور آخرت کا لفظ بھی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ متاعِ حیاتِ دنیا کی فنا کاریوں کے باوجود اسے حصول آخرت کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور انسان کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اپنے حصے کو نہ بھولے ﴿ ولاتنس نصيبك من الدنيا ﴾ (القصص: ۷۷)

یہ بات اہل فتاویٰ کو ہم سے کہیں زیادہ معلوم ہے کہ قرآن میں دین کا لفظ کسی مجموعۂ رسومِ عبادات کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ دینِ حق خدا پرستوں کی غیر مشروط عبودیت سے عبارت ہے۔ ﴿يكون الدين كله لله ﴾ ایک ایسی صورتحال پر منتج ہے جسے ﴿كلمة الله هيه العلياء ﴾ کہا جاسکے۔ پھر یہ بات بھی بہت واضح انداز سے بتادی گئی ہے کہ متبعین محمدؐ کی خدا شناسی انہیں کسی الگ دین پر قائم نہیں کرتی بلکہ یہ وہی دین براہمی ہے جس پر تمام انبیاء سابقین اور متبع نفوس گامزن رہے ہیں۔ لہذا آج ہم جن معنوں میں دینی مسائل یا دینی علوم کی بات کرتے ہیں دین کی کسی ایسی تعریف سے قرآن مجید کے صفحات خالی ہیں۔ اس سرزمین پر انسانوں کو جو بھی مسئلہ درپیش ہو قرآن چاہتا ہے کہ انسان اسے کتاب وسنت کی

روشنی میں حل کرے۔ اس کے برعکس اگر بعض مسائل کو اہل دنیا کے لئے اور بعض کو دین پرستوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تو مسائل کی یہ غیر فطری تقسیم فتنہ وفساد کا باعث ہوگی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسانی زندگی کا دین اور دنیا کی تفریق میں بٹا ہونا اسلام سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا اور وہ پوری انسانی زندگی کو کافۃً خدا کی اتباع میں دینے کا مطالبہ کرتا ہے تو پھر طبقۂ علماء کے لئے اس بات کی گنجائش کیسے نکل آئی کہ وہ خود کو دینی امور کا ماہر بتائیں اور عام انسانوں کو اس بات کی ترغیب بھی دیں کہ وہ دینی امور میں رہنمائی کے لئے ان کی طرف دیکھیں۔ عام طور پر اہل فتاویٰ اپنے اس مخصوص سماجی رول کے لئے ﴿فاسئلوا اهل الذكر﴾ والی آیت کا سہارا لیتے ہیں جس سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید اہل ذکر کے ایک طبقہ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تا کہ وہ مذہبی پیشوائی کا فریضہ انجام دے۔ البتہ آیت کو اس کے سیاق وسباق میں پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں اہلِ ذکر سے مراد دراصل علماء اہل کتاب ہیں جو وحی کے نزول کی روایت سے واقف ہیں جن کے لئے قرآن مجید کی دعوت اجنبی نہیں' لہٰذا جو لوگ اس آیت کو طبقۂ علماء کے وجود کے لئے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ دراصل اہل یہود کی طرح ﴿يحرفون الكلم عن مواضعه﴾ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک دوسری آیت جو اس سلسلہ میں بار بار دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے وہ سورہ توبہ کی آیت ﴿فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين و لينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم﴾ ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے کو پوری آیت کے ساتھ پڑھئے اور پھر اسے اس سیاق میں رکھئے جہاں یہ آیت وارد ہوئی ہے تو اس سے صرف یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ تمام مومنوں کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ اجتماعی طور پر جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوں بلکہ مسلمانوں کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ امور اجتماعی کی فہم وبصیرت کے لئے اپنے آپ کو مصروف رکھیں تو جہاد سے واپسی کے بعد اجتماعی زندگی کو منظّم کرنے میں یہ اہلِ علم معاون ثابت ہوں گے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو اس طرح بھی سمجھا ہے کہ ہر انسانی گروہ میں کچھ لوگ اپنے آپ کو فہم دین کے لئے مصروف کریں تا کہ وہ جب اپنی قوم کے پاس حصولِ علم کے بعد واپس آئیں تو انہیں تقویٰ شناسی کی ریت پر قائم رکھنے میں معاون ہوں۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں لفظ دین سے مراد رسومِ عبودیت، فقہی علوم یا نماز، روزے اور طہارت کے مسائل نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد خدا شناسوں کا اجتماعی نظام ہے اور کسی اجتماعی نظام کو چلانے کے لئے امور اجتماعیت کے ایسے ماہرین' جو وحی کی غایت سے واقف ہوں' ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ کہنا کہ اس آیت کے مخاطب موجودہ دور کے طبقۂ علماء ہیں تو یہ دراصل قرآن

مجید کی اس آیت کا مذاق اڑانا ہے۔ جب یہاں دین سے مراد علماء کا مزعومہ دین نہیں تو پھر اس ''دینِ علماء'' کے ماہرین قرآن کے مخاطب کیسے ہو سکتے ہیں۔

عیسائی خانقاہوں اور متصوفین کے حلقوں میں ڈاکٹر آف ڈوینیٹی کی ڈگری عہد وسطیٰ میں خاصی معروف رہی ہے۔ ان بھاری بھرکم اصطلاحوں پر مبنی ڈگریوں کی تقسیم کے ذریعہ اہل کلیسا دراصل عام انسانوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ عیسائی علماء جنہوں نے اپنی زندگیاں خانقاہوں کی نذر کی ہیں انہیں دینی علوم کے سلسلے میں سند کا اعتبار حاصل ہے۔ لوتھر کے ریفارمیشن سے پہلے اور خود اس کے عہد میں عیسائی حلقوں میں یہ بحث شدّ ومد کے ساتھ جاری رہی کہ کلیسا اہم ہے یا بائبل؟ اور یہ کہ کیا کلیسا کو بائبل پر ہر حال میں ترجیح دینا چاہئے؟ اہل کلیسا یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ بائبل کی تمام تشریح وتعبیر کا حق صرف اور صرف پوپ اور ان کے مصاحبین کو حاصل ہے۔ دوسری تعبیریں خواہ اسے بائبل کی آیتوں سے کیوں نہ مدلل کیا گیا ہو پوپ کی سند کے بغیر اسے اعتبار نہیں مل سکتا۔ تشریح وتعبیر پر طبقۂ علماء کی اجارہ داری کا یہ خیال اہل یہود کے یہاں بھی اسی طرح معروف ہے جہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں ربائی اکیوا تورات کے بہتر شارح ہیں۔ بلکہ یہودی علماء تو اس خیال کے بھی قائل ہیں کہ جب خدا نے ایک بار تورات بندوں کے حوالے کر دی تو اس کی تشریح وتعبیر اب علماء یہود کے بغیر ممکن نہیں۔

گو کہ اسلام میں کسی طبقۂ علماء کی اجارہ داری کی سخت نکیر کی گئی تھی لیکن عملاً ہوا یہ کہ عالم، فاضل، مفتی، قاضی اور محدث ومفسر جیسی اصطلاحوں میں ڈگریاں تقسیم کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ ہمیں ایک ایسے التباس فکری کی طرف لے گیا جہاں ہم یہ سمجھنے لگے کہ عالم یا فاضل کی ڈگریاں رکھنے والا شخص یا مفتی اور قاضی کا لاحقہ لگانے والا ہمارے ہی جیسا انسان اب ان لاحقوں کے ساتھ ایک ایسی مسند پر متمکن ہے 'جہاں مستند ہے اس کا فرمایا ہوا'۔ حالانکہ مدارسِ عربیہ میں عالمیت اور فضیلت کے دس بارہ سالوں پر مشتمل جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس کا ایک سرسری جائزہ لینے سے بھی یہ بات بآسانی واضح ہو جاتی ہے کہ محض ان چند کتابوں کی ورق گردانی کے بعد کسی شخص کو عالم بمعنی صاحبِ علم کہنا مناسب نہیں۔ جدید اسکولوں کے نصاب میں گزشتہ نصف صدی میں بڑی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے اور مسلسل اس بات کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ بدلتی دنیا میں معلومات کے نئے مآخذ سے نئی نسل کو پوری طرح واقف رکھا جائے لیکن اس کے باوجود ہم میں سے شاید ہی کوئی اس بات کی توقع کرتا ہے کہ ہمارے ہائر سکینڈری اسکول کے فارغین فکری اور عقلی اعتبار سے اتنے پختہ ہوں گے کہ صاحبِ علم کی حیثیت سے دنیا ان کے مشوروں پر انحصار کرے گی۔

اس کے برعکس یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کا علمی سفر تو اب شروع ہوا ہے، آگے یونیورسٹی کی فضا اور تحقیق و تجزیے کی مجلسیں ان میں تنقیدی نظر اور بصیرت پیدا کرسکیں گی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ مدارس عربیہ کی ثانوی درسگاہوں کے فارغین کی دس بارہ سالہ تعلیم کو علم و تحقیق کا کمال سمجھا جائے اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں کہ ثانوی سطح کے یہ فارغین ہماری رہنمائی کے لائق ہوگئے ہیں اور یہ کہ ان کے کلام کو اب دین میں برہان قاطع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، ایسا سمجھنا ان فارغین کے ساتھ ظلم سے کم نہیں۔

بھلا جو لوگ ابھی علوم کی ثانوی درسگاہ سے فارغ ہوئے ہوں اور وہ بھی ایسی درسگاہیں جہاں گزشتہ کئی صدیوں کے علمی ارتقاء کو داخلِ نصاب بننے سے روکے رکھا گیا ہو انہیں قیادت کے بلند منصب پر کیسے فائز کیا جاسکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہوا تو اس قیادت سے آپ کیا توقع کرسکتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں ارشاد ہے ﴿ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون ﴾ لیکن عملی دنیا میں ہم اس عقلی رویے کی پاسداری نہیں کرتے۔ اصحابِ فقہاء اور اصحاب افتاء کی مجلسوں میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ نئے مسائل کی تفہیم و تشریح اور اس پر کوئی شرعی حکم لگانے کے لئے پہلے تو ایسے ماہرین فن کی خدمت حاصل کی جاتی ہے جسے اس خاص مسئلہ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ پھر صاحبِ فن کی زبانی مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنے کے بعد اصحابِ فقہ اس بارے میں جائز و ناجائز، حلال و حرام کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے استعمال کے سلسلے میں جب علماء سے اس کے جواز کا فتویٰ پوچھا گیا تو اس بارے میں اہل علم فقہاء و مجتہدین کی ایک مجلس منعقد کی گئی، اب چونکہ علماء ان تکنیکی آلات کے مالہ و ماعلیہ سے واقف نہیں تھے اس لئے انہوں نے ایک ماہرفن کی خدمت مستعار لی۔ چند خطبات کی روشنی میں علماء نے انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی اور پھر جیسا کہ عموماً ہوتا آیا ہے اس کے جواز اور عدم جواز پر وہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ ٹیلی ویژن پر تصویروں کا آنا حرمتِ تصویر کے حوالے سے قابل انگیز نہیں ہے تو کسی کی رائے تھی کہ مالکی مکتبۂ فکر سے استفادہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسی تصویریں ہیں جس کا سایہ نہیں بنتا اس لئے مباح ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب مائکروفون پر اذان کا مسئلہ علماء کے سامنے آیا تھا تو اس وقت کے علماء نے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مائکروفون میں آواز کی حقیقت ہے کیا؟ یعنی وہ اصل آواز ہے یا اس کا عکس۔ اب چونکہ جدید طبیعات علماء کے حیطۂ علم سے باہر تھی اس لئے وہ قریبی اسکول میں سائنس ٹیچر ماسٹر سیتارام سے اکتساب فیض پر مجبور ہوئے جنہوں نے یہ بتایا کہ مائکروفون میں آواز کا بڑھ جانا دراصل کسی وادی میں آواز کی گونج سے مشابہ ہے۔ اس تفہیم کے

مطابق چونکہ مائکروفون کی آواز گونج یا عکس کے قبیل سے تھی اس لئے اصل آواز کے مقابلہ میں عکس کو لائق اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ البتہ آگے چل کر علماء کا سائنسی فہم ماسٹر سیتارام سے کہیں زیادہ عقیل وفہیم اصحاب فن کے تابع ہوا تو وہ اس بات کو پاگئے کہ اس آلہ میں اصل آواز کو ہی کئی گنا بڑھانے کی صلاحیت ہے۔ رفتہ رفتہ مائکروفون نے قبولیت عامہ کی حیثیت حاصل کرلی۔ کسی نے جب مولانا اشرف علی تھانوی سے گراموفون پر قرآن کی تلاوت کے سلسلہ میں پوچھا تو انہوں نے گراموفون کو آلۂ طرب بتا کر اس کے ذریعہ قرآن مجید سننے کومکروہ قرار دیا۔البتہ آج آڈیو، ویڈیو کیسٹ،وی سیڈیز، ڈی ویڈیز کی مختلف شکلوں کے رواج پاجانے کے بعد اب ہمیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ان CDs کی حیثیت مغنیوں اور رقاصاؤں کے کوٹھوں کی ہے جہاں سے ہمہ وقت نغمہ وطرب کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ علماء کے یہاں ٹیلی ویژن کے حلال وحرام کے بارے میں جو دو رائے پائی جاتی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے یہاں یہ مسئلہ فیصل نہیں ہوسکا ہے کہ ٹیلی ویژن پر آنے والی تصویروں کی حیثیت ہے کیا؟ یہ عکس ہیں یا اصل۔ بعض تو اس بنیاد پر اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ یہاں لائیوٹرانسمیشن (live transmission) میں بولنے والے کا عکس مثل آئینہ منتقل ہوتا ہے اگر وہ شخص کیمرے کے سامنے سے ہٹ جائے تو یہ عکس خودبخود غائب ہوجاتا ہے۔ بعض کہتے کہ لائیوٹرانسمیشن کو بھی دوبارہ relay کیا جاسکتا ہے۔ گویا یہاں تصویر کی حفاظت کا سامان موجود ہے اس لئے اسے مباح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بعض علماء فقہ حنفی میں تصویروں کی سخت گیر حرمت کے باوجود اس بات کے قائل ہیں کہ ٹیلی ویژن سے دعوتِ حق کی نشر و اشاعت کا کام لیا جانا چاہئے اور بعض اس بارے میں پرجوش ہیں کہ خود طبقۂ علماء کو دین حق کی اشاعت کے لئے اپنے راست کنٹرول میں ٹیلی ویژن کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے لیکن ان تمام ''شرعی'' آراء کے باوجود عام مسلمانوں کے لئے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہے کہ خدا کی نازل کردہ شریعت میں ان آلات جدیدہ کے بارے میں واقعی حکم ہے کیا؟ کوئی اس کے فوائد کا شمار کرتا ہے تو کوئی کہتا ہے اثمهما اكبر من نفعهما۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جو لوگ آلات جدیدہ کی تکنیکی باریکی کو سمجھنے کے اہل نہیں وہ اس بارے میں کوئی حتمی رائے دینے کی جسارت کیسے کرتے ہیں کہ انہیں اپنی اپنی آراء پر فتویٰ کا گمان ہو اور وہ عام انسانوں سے اس کی پیروی کی توقع کریں۔ گزشتہ دنوں سائنس کے مستقبل کے سلسلہ میں غوروفکر کے لئے اٹلی کے سیاحتی مقام وینس میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں stem-cell پر ہونے والی اب تک کی تحقیق پر دن بھر بڑی جوش وخروش کے

ساتھ بحث ہوتی رہی۔کلوننگ کے سلسلہ میں مذہبی حلقوں میں جو تحفظات پائے جاتے ہیں اس کا بھی کھل کر ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں مجمع فقہ اسلامی جدہ اور جامعہ ازہر کے فتاووں کا بھی تذکرہ آیا۔ اہل سائنس کو اس بات کی شکایت تھی کہ اس بارے میں مذہبی حلقوں سے جو آراء آئی ہیں ان کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات مسئلے سے فی نفسہ واقف ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسئلہ پر اب تک جو گفتگو ہوتی رہی ہے اس میں ایک پہلو تو پروپیگنڈہ عنصر کا ہے۔بعض محققین پروپیگنڈے کی زبان میں یہ باور کراتے رہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں DNA کو شاہ کلید کی حیثیت حاصل ہوگی جس کے ذریعہ صحت اور سیکورٹی کے شعبہ میں حیرت انگیز کام لیا جاسکے گا۔ رہی یہ بات کہ کلوننگ واقعی خدائی تخلیق میں انسانی مداخلت سے عبارت ہے تو اس مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنے کے لئے متخصصین جیسی نظر ہونی چاہئے جس کے بغیر مسئلہ پر کوئی بات سائنس فکشن کے انداز میں کلام کرنا ہوگا۔

یہ خیال کہ بعض انسانی تحقیق خدائی تخلیق میں مداخلت سے عبارت ہے اور یہ کہ ایسا کرنا مسند خدائی پر فائز ہونے کی کوشش ہے دراصل ایک مغالطہ سے کم نہیں۔ کائنات جیسی کہ اللہ نے پیدا کی ہے اپنے اندر بے شمار اسرار و رموز کی حامل ہے۔ روزِ اول سے انسانی تہذیب کا سفر انہی اسرار و رموز کی دریافت اور ان پوشیدہ قوتوں کو مسخر کرنے سے عبارت ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ انسان اس کائنات کی تسخیر کرے۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور اسی بارش سے اس سرزمین پر مختلف رنگوں کی فصلوں کا پیدا ہونا ایک ایسا مبہوت کردینے والا عمل ہے جس پر غور وفکر انسان پر خشیت الٰہی طاری کردیتی ہے۔ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ اس کے اصحابِ علم بندے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل جاری رکھیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی زبان میں اصل عالم کہا جاسکتا ہے: ﴿ انما یخشی الله من عباده العلماء ﴾۔ اس کے برعکس اگر ہم صرف یہ فیصل کرنے بیٹھ گئے کہ دیگر قومیں جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ان کا کون سا عمل شریعت میں مباح ہے اور کون سا حرام؟ یا یہ کہ ان کی کون سی ایجادات کو لائق استعمال قرار دیا جاسکتا ہے اور کون سی ایجاد پر عدم جواز کا فتویٰ چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ تو یہ ذہنی رویہ ہمیشہ ہمیں محض ان کے تعاقب میں مشغول رکھے گا اور ہم کبھی اس لائق نہیں ہوسکیں گے کہ دنیا ہماری اتباع اور اقتداء میں چلے۔ بھلا یہ کونسا شرعی علم ہے جس کے حاملین دنیا کی قیادت کے بجائے ایجادات و اختراعات کرنے والوں کے تعاقب میں رہتے ہوں اور جنہوں نے اپنا محض یہ فریضہ سمجھ رکھا ہو کہ ان کا کام آلات جدیدہ کی تحلیل وتحریم یا مباح و جواز کا فتویٰ دینا ہے۔

جو لوگ طبقۂ علماء کو وارثینِ علومِ نبوت سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ آخری رسولؐ کے متبعین کی حیثیت سے بعثت محمدیؐ سے تاریخ کے آخری لمحے تک انسانی قافلے کی رہنمائی کا فریضہ انہیں ہی انجام دینا ہے۔ موجودہ دنیا میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، وسائل کا چند ہاتھوں میں ارتکاز اور پوری دنیا کا سرمایہ داروں کے زبردست شکنجے میں کس جانے کا عمل ایک ایسا کریہہ منظر نامہ ہے جسے آخری رسولؐ کے متبعین ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ ماحولیات کی تباہی، موسموں کی غیر فطری تبدیلی، فطری وسائل کا اندھا دھند استعمال جیسے مسائل نے کرۂ ارض کے مستقبل کے سلسلہ میں جن شدید اندیشوں کو جنم دیا ہے اس کا مداوا بھی متبعین محمدؐ کو کرنا ہے۔ آنے والے دنوں میں روایتی ایندھن پٹرول کے بجائے متبادل توانائی کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ہائیڈروجن ایندھن کے ذریعہ ماحولیات کی آلودگی کو کم کیا جا سکتا ہے؟ یہ اور اس جیسے دسیوں سوالات کے اصل مخاطب دراصل آخری وحی کے حاملین متبعین محمدؐ ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ اقوام عالم کی قیادت پر فائز کئے گئے تھے اور جن سے یہ توقع تھی کہ وہ آیات اللہ فی الکون میں غور و فکر کے ذریعہ ایجادات و اختراعات کی قیادت کریں گے، وہ علم کی ایسی خود ساختہ تشریح و تعبیر کے اسیر ہو گئے کہ انہوں نے کائنات میں غور و فکر کو سرے سے اپنے وظیفے سے خارج کر دیا۔ عالم کی قرآنی تعریف سے دور شرعی اور غیر شرعی علوم کی ثنویت انہیں فکری زوال کی ایک ایسی دنیا میں لے گئی جہاں فقہاء یہود کی طرح ان کا کل وظیفہ شرعی اور غیر شرعی جیسی اصطلاحوں میں کلام کرنا طے پایا۔ حالانکہ اللہ نے اپنی کتاب میں حلال و حرام کی تفصیلات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں اور یہ بات بھی بتا دی گئی ہے کہ ﴿ منه آيات محكمات هن ام الكتاب و اخر متشابهات فأما الذين فى قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة ﴾۔ رہے وہ لوگ جو راسخون فی العلم تھے تو ان سے تو یہی توقع تھی کہ قیل و قال سے پرے ہو کر کہہ اٹھیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ عقل اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتی ہے کہ جو لوگ آلات جدیدہ کی ماہیت کے سلسلہ میں دوسرے ماہرین کے محتاج ہوں اور جو اب تک ٹیلی ویژن کی تصویروں کے سلسلہ میں اصل اور عکس کی بحث میں الجھے ہوں انہیں تو مسئلہ پر قول فیصل کہنے کا حق حاصل ہو البتہ وہ ماہرین جن کی ان مسائل اور آلات پر واقعی نظر ہو ان کے کلام کو اس بارے میں کوئی اعتبار حاصل نہ ہو۔

۳

بلادِمغرب میں مسلم شناخت کا مسئلہ

گزشتہ دنوں مجھے Sandi Tom کا ایک نغمہ 'I wish I was a Punk Rocker with flowers in my hair' سُننے کا اتفاق ہوا۔ ایک ایسی دنیا کا تصوّر جو اب صرف ہماری یادوں کا حصّہ ہے اور شاید جس کی اب ازسرِنو تعمیر ممکن نہیں۔ ایک ایسی دنیا جب موسیقی کی معنویت باقی تھی، جب ریڈیو کا راج تھا، جب اکاؤنٹنٹ ہماری زندگیوں کو کنٹرول نہیں کرتے تھے۔ جب ذرائع ابلاغ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہماری روح کا سودا کر سکے، جب پوپ اسٹار کا ظہور نہیں ہوا تھا، جب کم علمی ایک طرح کی رحمت تھی، ہائے وہ کیا زمانہ تھا جب لوگوں سے رابطے کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہوا کرتا تھا اور جب اطلاعات کی نئی شاہراہ دور فضا میں کہیں بھٹکا کرتی تھی۔ افسوس کہ گلوبلائزیشن نے زندگی کا حسن، اس کی سرّیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی خود ساختگی چھین لی ہے۔ ایک دم توڑتی رومانی دنیا کا نوحہ سُن کر مجھے ایسا لگا جیسے نغمے کی پُر تاثیر زبان سے دل کا مضراب بج اُٹھا ہو، حالاں کہ ہم اہلِ مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ وہ مغرب کے کرب اور ان کے مسائل کو اپنا مسئلہ تسلیم کرنے سے انکاری ہوتے ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے محسوس اور نامحسوس عمل نے انسانی زندگی کو کچھ اس طرح اپنے شکنجے میں کس دیا ہے کہ اب دنیا داروں کی دنیا سے الگ کسی اور دنیا کا تصوّر عملی طور پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ مشرق کے روحانی نفوس ہوں یا مغرب کی مادّہ زدہ قومیں، خدا کے

تابعدار ہوں یا اس کے باغی، یہ سب کے سب ایک ہی دنیا پر سوار ہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ دنیا کی سمت اور اس کی قسمت کے فیصلے کے سلسلے میں کمال سرد مہری کا مظاہرہ کریں۔

اب تک مسلمان عوامی سیکولر کلچر کے بارے میں محض تحفّظات کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہم نے عام انسانوں کی دنیا سے الگ اپنی قلعہ بند دنیا بنانے کی کوشش کی ہے۔ مسلم دانشوروں کا رویّہ یہ رہا ہے کہ وہ مغرب کی عوامی زندگی کے مقابلے میں مناسب متبادل کی فراہمی کا کام انجام دیں۔ لہٰذا عوامی موسیقی اور نغمہ کے مقابلے میں اسلامی میوزک کا ڈول ڈالا گیا جو قدیم صوفیانہ میوزک سے الگ جدید لب و لہجے میں ایک نئے مسلم پوپ کلچر کی تشکیل کی کوشش تھی۔ جہاں سچ پوچھئے تو نہ اسلام تھا اور نہ ہی میوزک۔ اسلامی میوزک اسلامک اکنامکس اور اسلامک سائنس جیسی اصطلاحوں نے پوسٹ ماڈرن معاشرے میں ایک مصنوعی قلعہ تعمیر کرنے کا احساس تو ضرور دلایا' البتہ اس پورے عمل میں مسلمان اصل دنیا سے کٹ کر رہ گئے' جہاں زندگی کا ریلا اور تاریخ کا بہاؤ ہماری دنیا کو ہماری خواہشات کے برعکس مسلسل مخالف سمت میں لے جا رہا تھا۔ جوں جوں دنیا کا سکڑنا ہم پر واضح ہوتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے گلوبلائزیشن کا شکنجہ سخت ہوتا جاتا ہے ہمیں صاف محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا تعمیر کردہ مصنوعی اور نفسیاتی حصار اب زمیں بوس ہونے کو ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت مسلمان اہلِ فکر جہاں کہیں بھی آباد ہیں وہ اس نئی صورت حال پر نئے انداز سے سوچنے کی ضرورت شدّت سے محسوس کر رہے ہیں۔

مغرب کے ان معاشروں میں جہاں مسلمان اجنبی معاشروں سے تعامل پر مجبور ہیں ان سوالات کی دھار اور بھی تیز ہوگئی ہے آیا مسلمان مغرب کے اجنبی معاشرے میں پوری طرح ضم ہو جائیں جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں بسا اوقات ہوا بھی ہے اور جس کی بنا پر امریکی عمرانی ماہرین فخریہ انداز سے اپنے معاشرے کو اقوام عالم کے لیے melting-pot کہتے رہے ہیں یا اس کے برعکس، وہ اپنے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو بچائے رکھنے کے لیے مغرب کے اجنبی معاشرے سے کم سے کم تعامل کی ریت پر قائم رہیں۔ اسلامی مراکز، کثیر مقاصد مساجد اور مسلم اسکولوں کے قیام کے پیچھے بنیادی طور پر یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ ان دو نقاطِ نظر کے مابین اب ایک تیسرا نقطۂ نظر' جس کی وکالت بعض پُر جوش نوجوان اہلِ فکر کر رہے ہیں' یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ مغرب کے معاشرے میں خود کو ضم (integrate) کریں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک ذمّہ دار شہری کے طور پر معاشرے میں سرگرم

رول (proactive) انجام دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان اب تک مغربی کے معاشرے میں حاشیے پر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو عمومی مسائل سے غیر مربوط رکھا ہے اس لیے معاشرے میں ان کا وزن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اگر وہ ایک مکمل شہری کے طور پر بھرپور رول کے لیے خود کو تیار کرسکیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے سیاسی اور سماجی وقار میں اضافہ ہوگا بلکہ مغربی ممالک بھی اپنے ان شہریوں کی صلاحیتوں اور ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے پوری طرح مستفید ہوسکیں گے۔ اس خیال کے حاملین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مغرب کی مخصوص ثقافت اور مغربی زندگی کے مختلف مطالبات کے سبب یہ بات بالکل فطری ہے کہ مغرب کے مسلمان عالم اسلام کے مسلمانوں سے قدرے مختلف دکھائی دیں اور یہ کہ وہ اپنے مخصوص لب و لہجے اور حالات کے سبب ایک نئی شناخت کے حامل ہوں۔

ایک نئے مغربی مسلمان کی شناخت اور مغربی اسلام کے قالب کی خواہش نے مسلمانوں کی نئی آبادیوں کو ایک سخت نظری تشنج سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایسا اس لیے بھی کہ مسلم اہلِ فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ مغرب کی ان حکومتوں کا قومی مفاد بسااوقات عالمِ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ خلیج کی پچھلی جنگوں، اور بالخصوص ۹/۱۱ کے بعد، عالمِ اسلام میں امریکی اور مغربی مداخلت نے اس خیال کو مزید سند بخشا ہے کہ مغربی پالیسی من حیث الامۃ مسلمانوں سے راست متصادم ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان ان حکومتوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں خوش دلی سے شامل ہوں۔ جب حالات کی سنگینی بعض امریکی سفارت کاروں، فوجیوں اور پالیسی سازوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہو کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی ملکی پالیسی سے بغاوت کریں، جب مغرب کے لاکھوں باضمیر انسان جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہوں تو بھلا مسلمانوں کے لیے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ جو حق و انصاف کے امین ہیں، مغربی حکومتوں کی صرف اس لیے ہمنوائی کریں کہ انھوں نے ان ملکوں کی شہریت اختیار کر رکھی ہے۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جہاں غیر اقوام کے احتجاج کو جمہوری عمل کا حصہ سمجھا جاتا ہے وہاں مسلمانوں کی طرف سے بلند ہونے والی صدائے احتجاج بالعموم اس طرح دیکھی جاتی ہے گویا یہ ایسے لوگوں کا شور شرابہ ہو جو مغربی معاشرے میں برسہابرس رہنے کے باوجود اس سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے ہیں۔

ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محمد رسول اللہ کی حیثیت تمام اقوامِ عالم کے لیے بشیر و نذیر کی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ عام طور پر اسلام کی جو تصویر مغرب میں پیش ہوتی رہی ہے وہ ایک ایسے دین کی ہے جو محض عالم مشرق کی تہذیبی میراث ہو۔ محمد رسول

اللہ کو نبی عربی یا عالم عرب کا پیغمبر یا (Prophet of the Desert) سمجھا جانا بہت کچھ معمول کی بات سمجھی جاتی ہے ۔ پھر یہ خیال بھی عام ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے جس طرح عیسائیوں کے لیے بائبل اور یہودیوں کے لیے توراۃ ۔ یہ تمام باتیں خواہ حقائق کا معتبر ترین اظہار کیوں نہ سمجھی جائیں واقعہ یہ ہے کہ ان بیانات سے اسلام اور محمد رسول اللہ کے واقعی مقام کا صحیح تعیّن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً ترجمہ کے پیدا کردہ بعض مسائل ہیں؛ جس نے اسلام کی صحیح تعریف کو غیر عرب اقوام تک پہنچنے سے روکے رکھا ہے ۔ گو کہ مشرق میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اسلام کو ایک تہذیبی شناخت کے بجائے عبودیت پر مبنی ایک رویّہ سمجھتے رہے ہیں کہ ہمارے یہاں اس قبیل کی روایتیں زبان زد عام رہی ہیں کہ الاسلام لیس بتمنیٰ فقط و لکن ماوقرفی القلب و صدق له العمل البتہ مغرب میں اسلام کی اس تعریف کو متعارف کرانے کا سہرا ایک عیسائی مستشرق W.C. Smith کے سر جاتا ہے جنھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ عیسائی روایت میں خدا کے ایک فرماں بردار بندے ہیں اس لیے عربی زبان میں ان کے لیے لستُ بمسلم کہنا امر محال ہے ۔ کہ عربی میں مسلم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والا یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ فرماں برداروں میں سے ہے البتہ جب انگریزی میں کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق قومِ مسلم سے ہے ۔ ترجمے کا پردہ اگر چاک کر دیا جائے تو غیر عرب اقوام کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ قرآن مجید صرف قومِ مسلم کی کتاب نہیں بلکہ خدا کے ان تمام اطاعت گزاروں کا مشترکہ سرمایہ ہے خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہبی ، تہذیبی ، لسانی یا جغرافیائی سلسلے سے پایا جاتا ہو۔ اور یہی منطقی جواز ہے محمد رسول اللہ کے رحمتِ عالم ہونے کا ۔ لیکن افسوس کہ مسلمان علما و دانشور اسلام کے اس آفاقی لب و لہجہ کو متعارف کرانے میں ناکام رہے ہیں ۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلام کی دعوت کسی زمانی، قومی اور تہذیبی تشخص سے ماوراء ہے ہاں یہ سچ ہے کہ آپؐ کی بعثت ایک عرب معاشرے میں ہوئی اور ایک آفاقی معاشرے کی تعمیر کا تجربہ عرب معاشرے سے شروع ہوا البتہ ابتدائی دنوں میں ہی قرآن نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ بعثت محمدی کا مقصد کسی تہذیبی اکائی کا احیاء یا کسی نئی مذہبی شناخت کا قیام نہیں بلکہ آپؐ کا کام اس دینِ ابراہیمی کا احیاء ہے جس سے وابستہ مختلف مذہبی طائفے اپنے بارے میں مختلف قسم کی خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں ۔ اور جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ محض کسی نبوی سلسلے سے وابستگی ان کے لیے وجہ نجات بن سکتی ہے ۔ قرآن نے ان

تصوّرات کا قلع قمع کیا کہ محض یہودی عیسائی یا محمدی سلسلوں سے وابستگی کسی کے لیے وجہ نجات بن سکتی ہے۔اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح کا امتزاج کسی بھی شخص کو خواہ اس کا تعلق ان مذکورہ خیموں سے ہو یا نہ ہو ﴿لاخوف علیهم ولاهم یحزنون﴾ کی بشارت دے سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ماضی میں ایمان کی پیمائش اور نجات کی بنیادی شرائط پر جو متکلمانہ بحثیں ہوئی ہیں اس نے قرآن کے ان منصفانہ اور آفاقی بیانات پر بڑی حد تک پردہ ڈال دیا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اہلِ یہود پر قرآنی تنقید ﴿لن تمسّنا النار الاایاماً معدودة﴾ بڑی حد تک مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے جنھوں نے بعض خوش گمان روایتوں کے زیر اثر محمد رسول اللہ کو یومِ آخر میں مسلم قوم کی داد رسائی کے لیے منصب شفاعت پر فائز کر رکھا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ اسلام کی یہ قومی تصویر جو جمہور عوام میں مقبول عام ہے قرآن کے آفاقی لب و لہجہ سے میل نہیں کھاتی۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں قطعی تکلّف نہیں کہ ایک ایسے مخلوط معاشرے کا خواب جس میں تمام مذہبی اور تہذیبی طائفوں کی سعید روحوں کو یکساں خوش گواری کا احساس ہو اور جہاں تمام انسانوں کو خیر کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے، ہماری مذہبی آرزوؤں کا امین ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں ان قرآنی آیات کا ازسرِنو مطالعہ کریں جن پر فقہا کی قیل و قال اور تاریخ و روایات کی گرد نے حجابات حائل کر دیے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ محمد رسول اللہ کی دعوت تمام انبیاء کی دعوتوں کا ارتکاز ہے جہاں صرف نبوت محمدی پر ایمان لانا کافی نہیں بلکہ تمام انبیائے سابقین اور ان پر نازل ہونے والی وحی کو صدقِ دل سے قبول کرنا بھی ایمان کا لازمہ ہے۔ سورۃ بقرۃ کی آیات ۱۳۵، ۱۳۶ جہاں یہود و نصاریٰ (روایتی مسلم) بننے کے بجائے تمام انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے ہم سے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ ہم بلاامتیاز فضیلت ﴿لانفرق بین احدمنهم﴾ تمام انبیاء پر ایمان لائیں۔ سو اگر ہم نے ایسا کیا تو راہ یاب ہوئے ورنہ گمرہی ہمارا مقدر بن گئی ﴿فان آمنو بمثل ما آمنتم به فقداهتدوا﴾ (بقرۃ ۱۳۷)۔ متبعیّن محمد کی حیثیت سے ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم قومی اور تہذیبی تشخص سے ماوراء اپنے لیے ایک ایسا آفاقی قالب تشکیل دیں جس پر تمام انبیائے سابقین اور ان کے متبعیّن کی مشترکہ شناخت کا رنگ پایا جاتا ہو جسے

قرآن صبغۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور جسے کبھی لفظ مسلم کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک طویل تاریخی عمل میں مسلم ہونا ایک قومی شناخت بن کر رہ گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے دوبارہ صبغۃ اللہ سے متصف کیا جائے۔

اسلام کے بارے میں ایک غلط فہمی جو مغرب میں اب بھی عام ہے وہ یہ ہے کہ بالعموم اسے انبیائی سلسلوں کے ارتکاز کے بجائے فرقۂ محمدی (Muhammad-centered religion) کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید کا واضح مطالبہ ہے کہ لوگو! ربّانی بنو ﴿کونوا ربّانین﴾ ان معنوں میں کہہ لیجیے کہ اسلام ایک God-centered دین ہے۔ حضرت مسیح کے بغیر عیسائیت کا تصوّر محال ہے لیکن محمد رسول اللہ کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے ﴿وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم﴾ تمام انبیاء ربّانی بنانے کے لیے آئے تھے۔ عیسائی، یہودی یا دیگر قومی شناختوں کے قیام کے لیے ان کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔ انبیاء کسی نہ کسی تہذیبی، لسانی یا جغرافیائی سلسلے سے آتے ہیں۔ اس لیے ایک وسیع آفاقی معاشرے کا قیام تبھی ممکن ہے جب تمام انبیاء کو قبول کرتے ہوئے ربّانی شناخت کا ڈول ڈالا جائے۔ صبغۃ اللہ کی یہ دعوت ایک ایسے مخلوط ایمانی معاشرے کا تصوّر پیش کرتی ہے جہاں تمام انبیاء کے راہ یاب طائفے خیر کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک ایسا رنگا رنگ معاشرہ جہاں عبودیت کے مختلف طریقے رائج ہوں نہ صرف یہ کہ خدائی اسکیم کا حصّہ ہے بلکہ قرآنی دائرۂ فکر میں اس بات کی پوری گنجائش موجود ہے کہ اس تہذیبی اور مذہبی بوقلمونی کو برقرار رکھا جائے۔ سورہ حج (آیت ۴۴) میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اہلِ کتاب کی عبادت گاہیں (اور ان پر دوسرے ادیان کو قیاس کیجیے) خدا کے ذکر کثیر سے معمور ہیں۔

یہ ہے وہ مختصر ترین خاکہ اس آفاقی اسلام کا جس کی قیادت گو متبعین محمد کے ہاتھوں میں ہے، کہ وہ آخری وحی کے امین ہیں، البتہ اس نبوی پروجیکٹ میں تمام ہی انسانی گروہوں کو اپنی اپنی بساط اور توفیق بھر شریک ہونا ہے۔ ظاہر ہے اتنے بڑے کام کی تکمیل مسلمان اپنے خول میں بند ہو کر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جو لوگ مسلمانوں کو ایمان کی حفاظت کے لیے قلعہ بند ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں وہ یقیناً اسلام کی اس آفاقی حیثیت سے آگاہ نہیں۔ ماضی میں جن فقہاء نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کے دو مختلف بلاکوں میں تقسیم

کرنے کی کوشش کی انھوں نے بھی اسلام کے اس آفاقی پیغام کا پاس نہیں رکھا۔ رہے وہ لوگ جو مغرب میں مسلمانوں کو محض ایک عام شہری کی حیثیت سے معاشرے میں بھرپور شرکت کی دعوت دے رہے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اہلِ یہود کی طرح مغربی ملکوں میں مسلم وزراء اور پالیسی سازوں کی بھی ایک کھیپ پیدا ہوجائے وہ بھی اسلام کے بنیادی مشن سے ناواقف ہیں۔ مغرب کے مختلف ملکوں میں اگر مسلمان اپنی بھرپور شرکت کے ذریعے اعلیٰ ریاستی مناصب تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ انھیں امریکہ اور یورپ کی حکومتوں کا کنٹرول بھی حاصل ہوجاتا ہے تو اسلام کا وہ مشن تشنۂ تکمیل ہی رہے گا جس کا مقصد بلا امتیاز رنگ و نسل تمام اقوام کی فلاح و نجات کا سامان کرنا ہے۔ ایک سچّے مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے ایک ایسی صورت حال قابلِ قبول نہیں ہوسکتی کہ ہم چور دروازوں سے اقوامِ عالم کی گردنوں پر اپنے سیاسی تسلّط کا خواب دیکھیں۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب ہو یا مشرق مسلمانوں کا اپنے تہذیبی حصار میں محبوس رہنا سمِّ قاتل ہے۔ البتّہ ایک بھرپور شرکت کی دعوت دینے سے پہلے لازم ہے کہ ہم بعض خوش فہمیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ بھلا اس خیال کو ہم کیسے دفن کرسکتے ہیں کہ ہم جس نظامِ انصاف کے داعی ہیں اس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا قومی مفاد دیگر اقوام کے قومی مفاد سے متصادم نہ ہو۔ مغرب ہی کیا مسلمانوں کے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اقوامِ مشرق کے مفادات کے تحفّظ کے لیے سامنے آئیں کہ ان کی نظر میں تمام اقوامِ عالم ایک خدائی کنبہ ہے جس کی اجتماعی فلاح و بہبود، نصح و خیرخواہی اور فلاح و نجات پر انھیں مامور کیا گیا ہے۔ اس پیمبرانہ منصب سے کنارہ کشی کے بغیر ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم نیشن اسٹیٹ کے مفادات کے لیے خود کو پیش کرسکیں۔ اس بارے میں بعض لوگ اہلِ یہود کی مثال دیتے ہیں کہ جب تک اہلِ یہود اپنے تہذیبی اور مذہبی حصار میں بند رہے ان کا مقام تاریخ کا حاشیہ رہا۔ لیکن جب انھوں نے اس نفسیاتی حصار کو توڑ ڈالا تو ان کے لیے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ نہ صرف یہ کہ وہ اقوامِ عالم کا ہراول دستہ بن گئے بلکہ مغرب کے بعض ممالک میں انھیں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوگئی۔ اہلِ یہود کی حیرت انگیز کامیابی میں یقیناً ہمارے لیے بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ البتّہ اس تجربے کا بہ نظر غائر تجزیہ کی ضرورت ہے۔ ہم اس خیال کی تو یقیناً تائید کرتے ہیں کہ علوم کی دینی اور دنیوی تقسیم کو ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ اکتشافی علوم کے سلسلے میں ہمارا ذہنی تحفّظ قرآنی دائرہ فکر سے متصادم

ہے۔ البتہ ہم اس خطرے کا احساس بھی دلا دینا چاہتے ہیں کہ مغرب کے مکمل نظری شہری کے طور پر مسلمانوں کو متحرک کر دینا بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب ان کے دل و دماغ پر پیمبرانہ مشن کے مطالبات کا فقدان ہو ہماری آنے والی نسلوں کی مکمل نظری تباہی کا سبب ہوسکتا ہے۔ Moses Mendelssohn جسے Reformed Judaism کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے جس نے اہلِ یہود کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنی قومی شناخت کو خیرباد کہتے ہوئے مقامی معاشروں کی شناخت اختیار کریں، خود اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ جو صورت حال پیش آئی وہ بھی ہمارے لیے کم عبرت انگیز نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منڈلسن کی دونوں بیٹیاں اس کی زندگی میں عیسائی ہوگئیں اور صاحبزادے نے اس کی موت کے بعد یہ کہتے ہوئے یہودیت کو خیرباد کہا کہ فی زمانہ چوں کہ عیسائیت ہی متمول لوگوں کا مذہب ہے اس لیے وہ اپنی پُرانی یہودی شناخت پر اصرار کے لیے کوئی معقول جواز نہیں پاتے۔ منڈلسن کی تحریک نے اہلِ یہود کے لیے یقیناً آنے والے دنوں میں بلاروک ٹوک مغرب میں اعلیٰ مناصب کے لیے راستے کھول دیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مغربی ریاستوں کو یرغمال بنالینے کے سبب اہلِ یہود آج اس لائق ہیں کہ وہ کسی حد تک اپنی دو ہزار سالہ جلاوطنی کا مداوا کرسکیں۔ لیکن ایک خالص نبوی پروجیکٹ جس طرح سیکولر اور مادہ پرست یہودیوں کے ذریعے ہائی جیک ہوگیا ہے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے روشن خیال مفکّرین بھی یقیناً اس صورت حال کو قبول نہیں کر پائیں گے کہ چند مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے لوگ مغرب میں کلیدی عہدوں پر فائز ہوجائیں اور اس کے بدلے اسلام اور اسلامی مشن پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فاتحہ پڑھ لیا جائے۔

ہمارے خیال میں مسئلہ کا حل نہ تو intergration میں ہے اور نہ ہی isolation میں، اور نہ ہی contribution اس ذہنی تشنج سے، جس میں مغربی مسلمان خود کو گھرا پاتے ہیں، انھیں نجات دلاسکتا ہے۔ جب تک اجنبی معاشرے میں بھرپور شرکت کے لیے نظری بنیادیں فراہم نہیں کی جاتیں اور جب تک مسلمانوں کو اس بات پر مطمئن نہیں کیا جاتا کہ مغرب کے ایک وفادار شہری کے طور پر ان کی سرگرمی اسلام کا مطلوب و مقصود ہے اس وقت تک 'contribution' کے داعیوں کو apologists کے طور پر ہی دیکھا جاتا رہے گا۔ ہمیں اس سوال کا شافی جواب فراہم کرنا ہوگا کہ اگر مسلمان مغرب کے معاشروں میں ایک مستند شہری کی حیثیت سے سرگرم رول ادا کرنے کو اپنا مطلوب و مقصود جانیں گے تو دیگر اقوام کے مقابلے

میں ان کا وجہ امتیاز کیا ہوگا۔ محض یہ کہنا کہ مسلمان اپنی اعلیٰ اخلاقیات اور روحانی ورثے کے ساتھ مغرب کے معاشرے کو (enrich) مستفید کرسکیں گے نہ صرف یہ کہ معذرت خواہانہ طرزِ فکر ہے بلکہ اسلام کے عظیم مشن کو اخلاقیات میں محدود کرنے کے مماثل بھی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ان تینوں مروجہ رویّوں سے آگے بڑھ کر خود کو ایک نجات دہندہ گروہ کے طور پر متعارف کرائیں۔ ایسے زندہ دل اور بیدار مغز لوگوں کا گروہ جو مشرق میں ہوں یا مغرب میں' انھیں اپنی فکر سے کہیں زیادہ اقوام عالم کی فلاح ونجات کی فکر رہتی ہو۔ موجودہ سامراجی نظام میں جہاں سرمایہ کا ارتکاز' ذرائع ابلاغ کی پیدا کردہ دھند، ماحولیات کی تباہی، اسلحوں کی دوڑ اور ٹیکس کی جبری مشین نے فرد کے لیے زندگی جہنّم بنادیا ہو اور جہاں عام انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی طائفے یا خطّے سے ہو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے کسی نجات دہندہ کا منتظر ہو' آخری وحی کے حاملین پر لازم ہے کہ وہ تاریخ کے اس نازک لمحے میں انسانوں کی مسیحائی کے لیے سامنے آئیں۔ گویا متبعین محمدؐ کو صرف اپنی فلاح ونجات کے بجائے دنیا کے چھ بلین انسانوں کو موجودہ نظامِ جبر سے نجات دلانے کا کام بھی انجام دینا ہوگا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ اسلام کے اس پیمبرانہ نظری قالب کا احیاء کرسکیں جو صبغۃ اللہ سے عبارت ہو، کونوا ربّانیین کی دعوت سے متصف ہو اور جس پر کسی قومی، لسانی یا تہذیبی احیاء کا شائبہ بھی نہ پایا جاتا ہو۔ جب تک اسلام کے ایک ایسے آفاقی قالب کی تشکیل عمل میں نہیں آتی دیگر اقوام کے لیے متبعین محمدؐ کی دعوت پر انبوہ درانبوہ لبیک کہنا ممکن نہ ہوگا۔



قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔ قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو ان آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب و غریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جائے۔ لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور و فکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالے سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدارس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔

۴

ہم کیوں پیچھے رہ گئے؟

مسلمان جو خیر امت کے دعویدار ہیں اور جنہیں آخری رسولؐ کے متبعین کی حیثیت سے بجا طور پر سیادت عالم کے منصب پر فائز ہونا چاہیئے تھا وہ صدیوں سے خود کو ایک چبھتے سوال کے زد میں پاتے ہیں۔ اگر واقعی وہ خیر امت ہیں اور اگر اہل ایمان کے لئے دنیا و آخرت دونوں جہان میں کامیابی کے وعدے ہیں تو آخر ایسا کیوں ہے کہ امت مسلمہ کا گراف مسلسل روبہ زوال ہے۔ گیارہ ستمبر اور اس کے بعد کے واقعات نے اس سوال کی دھار کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ ایک ایسی امت جو عددی اعتبار سے دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل ہو، جو جغرافیائی اعتبار سے اسٹراٹیجک علاقوں میں سکونت پذیر ہو اور جس کی سرزمین فطری وسائل سے مالا مال ہو، آخر ایسا کیوں ہے کہ جدید دنیا میں اس کی حیثیت محض صارف کی ہو کر رہ گئی ہے۔ انسانی زندگی میں ٹیکنالوجی کی پیش رفت اور ایجادات و اختراعات سے مستقبل کی زندگی کا جو نیا نقشہ مرتب ہو رہا ہے اس میں ہمارا تخلیقی حصہ بمنزلۂ صفر کے ہے۔ مثال کے طور پر یہ خیال کے دوسرے سیاروں پر انسانی زندگی کے امکانات سے اہل زمین کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا' انسانوں کے جنیٹک کوڈ کی دریافت کے بعد مستقبل میں عام فلاح کے لئے اسے کس طرح استعمال کیا جاسکے گا یا یہ کہ خلیوں کی تحقیق کے نتیجے میں اگر بڑھاپے کو روکنا یا شباب کو طول دینا ممکن ہوسکا تو اس سے ہماری معاشرتی زندگی پر کیا اثرات پڑیں گے یا یہ کہ ایک ایسی دنیا جہاں ہر ذی روح اپنے شناختی کوڈ یا مائیکرو چپ کے سبب بین المواصلاتی نظام کا

قیدی بن کر رہ جائے گا‘ ایک ایسی دنیا کے طلوع کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں کسی فیصلہ کن موقف اختیار کرنے اور اس بارے میں مناسب اقدام کرنے کا ہم مسلمان خود کو اہل نہیں پاتے۔ گویا موجودہ دنیا میں جو لوگ مستقبل کا منشور تیار کررہے ہیں وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔

پھر یہ کیسا وعدہ ہے کہ ﴿ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ﴾۔قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اہل ایمان کو غلبہ اور تفوق کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جنہوں نے کفر کا ارتکاب کیا‘ جو خدا کے باغی ہوگئے‘ ان کے لئے آخرت میں تو دردناک عذاب ہے ہی دنیا میں بھی ان کا مقام بس یہ ہے کہ وہ صاغرون بن کر رہنے پر اکتفا کرلیں۔ اہل کفر کی دنیاوی زندگی تعذیب و تذلیل سے عبارت ہے۔ دین فطرت کے خلاف بغاوت انہیں ایک ایسے مقام پر پہونچا دیتی ہے کہ وہ کائنات میں جاری تخلیقی عمل سے الگ تھلگ ہوجاتے ہیں۔ پالیسی امور میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ محض مادے کی سطح پر چوپاؤں کی طرح زندہ رہنا ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

کفر اور ایمان دراصل دو الگ الگ رویے ہیں۔ یہ کوئی ایسی شناخت نہیں جو قوموں کو پیدائشی طور پر ودیعت ہوتا ہو۔ انبیائے کرام نے جب بھی مردہ روحانی معاشرے میں زندگی کا صور پھونکا کفار ومشرکین کے معاشرے سے دیکھتے دیکھتے اہل ایمان کی ایک بڑی تعداد سامنے آگئی۔ پھر یہی لوگ جب قومی مسلمان بن گئے اور ان کی روحانی زندگی زوال پذیر ہوتی گئی تو ان ہی قوموں میں ایسے نفوس بھی پیدا ہوگئے جنہوں نے خدا سے بغاوت اور سرکشی کی نئی تاریخ رقم کی۔ افسوس کے اہل ایمان کے یہ طائفے جن میں بغاوت اور سرکشی کا ظہور ہوا‘ اس حقیقت کو نہ سمجھ پائے کہ کفر ہو یا اسلام اس کا انحصار زبانی دعویٰ پر نہیں بلکہ عمل پر ہے۔ خدائے واحد کی اطاعت شعاری پر کسی مخصوص قوم یا فرد کی اجارہ داری نہیں۔ قرآن مجید نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح اہل یہود مدت سے اس خیال میں گم ہیں کہ وہ اب بھی اپنے تمام فکروعمل کے زوال کے باوجود تمام اقوام عالم پر فضیلت رکھتے ہیں۔

اہل یہود کی طرح ہم مسلمان بھی مدت سے کچھ اسی قسم کی خوش فہمی کے اسیر ہیں کہ اپنی تمام کج فکریوں کے باوجود آخر ساعت تک کے لئے دنیا کی سیادت ہمارے حصّے میں لکھ دی گئی ہے۔ البتہ عملی زندگی کے تلخ حقائق ہمیں خیر امت کی مختلف تشریح وتاویل پر مجبور کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے‘ جیسا کہ ہمارے ایک کرم فرما نے پچھلے دنوں اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ خیر امت تو ہم ہی ہیں اور اقوام عالم کی سیادت پر فائز بھی ہمیں ہی کیا گیا ہے اب چاہے کوئی ہماری اقتدا کرے یا نہ کرے۔ کوئی کہتا ہے کہ غلبہ سے مراد

سیاسی، معاشی یا تہذیبی غلبہ نہیں بلکہ عالم روحانیت میں اعلیٰ مقام کا حصول ہے اور یہ کہ کشف و مجاہدے کی دنیا میں ہم نے جو جھنڈے گاڑ رکھے ہیں کیا مجال کہ دوسری قومیں اس کے قریب بھی پھٹک سکیں۔ دوسری طرف اصحاب باطن ہیں جو گاہے بگاہے اس بات کی خبر دیتے رہتے ہیں کہ ابدال و اوتاد اور اقطاب کی مجلس میں جلد ہی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا جانے والا ہے جس سے دنیا کی صورتحال میں حیرت انگیز تبدیلی آجائے گی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ تاویلیں ہمیں صورت حال کے صحیح ادراک سے روکنے میں مسلسل کامیاب رہی ہیں ؎

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

سچ تو یہ کہ پچھلی کئی صدیوں سے، بلکہ ابوحامدالغزالی سے لے کر آج تک، مسلم ذہن مسلسل ایک مخمصے کا شکار ہے۔ اس سلسلے میں نئی دینیات کی تشکیل کی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اس سوال کی دھار کو کم کرنے کے بجائے اس میں مزید اضافہ کا سبب بنی ہیں۔ وہ لوگ جو خود کو اہل ایمان سمجھتے ہوں اور جنہیں اس بات پر مکمل یقین ہو کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے، خیرامت سے متصف، غلبہ و سیادت کی بشارت کے مستحق ہیں لیکن اس کے باوجود عملی زندگی میں وہ دوسروں کی اقتدا اور ان کے انحصار پر خود کو مجبور پاتے ہوں تو یقیناً وہ اپنے آپ کو ایک بڑے روحانی مخمصے میں مبتلا پائیں گے۔ گزشتہ دنوں ذات ختمی رسالت کے بارے میں کارٹون سازی کی جو مذموم حرکت کی گئی اور اس پر پوری مسلم دنیا کا جو زبردست ردعمل سامنے آیا اس نے بھی اس سوال کے صحیح جواب کی فراہمی میں ہماری زیادہ مدد نہیں کی۔ مراکش سے انڈونیشیا تک مظاہرین کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر نے ہمیں بظاہر تو یہی احساس دلایا کہ خدا اور اس کے رسول سے وابستگی میں اب بھی ہم مسلمانوں کا کوئی عشرعشیر بھی نہیں۔ البتہ ہمارے اہل فکر نے اس بات کی طرف توجہ کم ہی دی آیا یہ مظاہرے امت مسلمہ کے نظری موقف کا فی الواقع صحیح عکاس بھی ہیں یا نہیں۔

اصل صورت حال کا ادراک

بظاہر جن چیزوں کو ہم مظاہر ایمان سمجھ بیٹھے ہیں اور جن باتوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں خدا اور اس کے رسول کے تئیں وابستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ذرا گہرائی سے تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ بدقسمتی سے دراصل ایسا ہے نہیں۔ مثال کے طور پر ایران اور شام میں کارٹون مخالف مظاہروں میں شدت اور اس کی آڑ میں بعض مغربی سفارت خانوں کو نشانہ بنانا دراصل مقامی حکومتوں کی سیاسی ضرورتوں کے تابع

تھا۔ اسی طرح پاکستان میں اسلام پسند جماعتیں یہ سمجھ رہی تھیں کہ ناموس رسولؐ کے حوالے سے ان کے لئے اپنے سیاسی اہداف کے حصول کا سنہری موقع آپہونچا ہے۔ عالم عرب میں یوسف القرضاوی کی قیادت میں اخوانی اور سلفی گروہوں کا اجتماع بھی دراصل اسی خیال سے غذا حاصل کر رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں نصرت رسولؐ کے حوالے سے خطے میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی کے لئے راہ ہموار ہوسکتی ہے اور یہ کہ گیارہ ستمبر کے بعد سے اسلام پسند قوتیں جو مسلسل امریکی اور مقامی استبدادی حکومتوں کے نشانے پر رہی ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرسکتی ہیں۔ الہ آباد کے ایک بڑے اجتماع میں جو ناموس رسولؐ کے حوالے سے منعقد ہوا تھا اور جس سے مجھے بھی خطاب کرنے اور جہاں عوامی جوش و جذبے کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا وہاں بھی ذات ختمی رسالت سے محبت کے پس پردہ دوسرے عوامی اور سیاسی محرکات کہیں غالب تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ جو جلسہ ناموس رسولؐ کے حوالے سے بلایا گیا تھا اور جہاں علماء و قائدین، مشائخ و متصوفین کی ایک بڑی تعداد جمع تھی اسے اپنے جوش خطابت میں اس بات کا خیال بھی نہ رہا کہ ظہر کا وقت کب آیا اور کب گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر واقع شہر کی جامع مسجد پر ویرانی چھائی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا کہ مسجد کے اردگرد دشمنان اسلام کے پتلے جلانے کا عمل جاری رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ فلک شگاف نعروں اور ہاؤ ہو کے ہنگاموں میں امت کی سمت کھوئی گئی۔ نہ تو عوام کو اپنے نظری منصب کا احساس رہا اور نہ ہی علماء و قائدین کو اس بات کی فکر کہ ہاؤ ہو کے یہ ہنگامے اور طرب خیزیاں متبعین محمدؐ کے شایان شان اور ان کی نظری تصویر کی عکاس بھی ہیں یا نہیں۔

جب عشق رسول کے نام پر بے ہنگم نعرہ بازیاں اور خالی خولی طرب خیزیاں قبول عام اختیار کرلیں تو عام انسانوں کے لئے صورت حال کی نزاکت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اولاً عوام ان ہنگامہ خیزیوں کو مقصود دین جانتے اور اس خیال سے مطمئن رہتے ہیں کہ ہماری حمیت ایمانی بدرجۂ اتم زندہ و تابندہ ہے۔ ثانیاً عوام کی زوال زدہ دینی حسّیت دنیا دار حاملین اور سیاسی بازیگروں کو مسلسل اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ عوامی جذبات کے استحصال کے ذریعے دین کے حوالے سے اپنی مطلب براری کی تحریکیں چلاتے رہیں۔ اور چونکہ دین کے اس مسخ شدہ تصور میں ہنگامہ ہائے ہو سے اتنی زیادہ گرد اٹھتی ہے کہ صالح قیادت کے لئے اپنی بات کہنے اور عوامی غیظ وغضب کا سامنا کرنے کا امکان معدوم ہوجاتا ہے۔ گویا خدا اور اس کے رسول سے وابستگی کے نام پر گزشتہ چند صدیوں میں ہمارے درمیان جس طرح کی پرشور تحریکوں نے اپنے قدم جمائے ہیں اس نے بڑی حد تک صورت حال کے صحیح ادراک سے ہمیں روک کے

رکھا ہے۔ ہم جسے مظاہر ایمان سمجھ بیٹھے ہیں وہ نری جذباتیت ہے۔ خالی الدماغ لوگوں کا رویہ ہے۔ یہ ان کا رویہ نہیں جن کی فراست سے ڈرنے کی بات کہی گئی ہے۔ جب تک اہل ایمان اپنے اس رویہ میں بنیادی تبدیلی نہیں لاتے اور قرآن مجید کے صفحات میں سنجیدہ غور وفکر کے لئے آمادہ نہیں ہوتے انہیں اس سوال کا شافی جواب نہیں مل سکتا کہ آخر اہل ایمان غلبہ واستیلاء کی تمام قرآنی بشارتوں کے باوجود اس دنیا میں خود کو حاشیہ پر کیوں محسوس کرتے ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اسلام محض زبانی ایمان کا قائل نہیں۔ مسلم متکلمین کے درمیان یہ بات ابتدائی صدیوں میں ہی بحث کا موضوع بن گئی تھی کہ صرف زبانی اقرار کو استناد حاصل ہوسکتا ہے یا عملی رویے سے بھی اس کی شہادت لازم سمجھی جائے گی۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ایمان کے ساتھ عمل صالح کا مطالبہ دراصل اسی بات پر دال ہے کہ مؤمنین صادقین کا ایمان ہمیشہ عمل سے اپنی تصدیق کرتا ہے اس کے برعکس منافقین اپنے قولی ایمان کا اپنے عمل سے مسلسل انکار کرتے رہتے ہیں۔ گویا جس ایمان کی پشت پر عمل کی قوت نہ ہو اسے قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا۔ ابتدائی عہد کے مسلمان جو ایمان کی اس لذت سے آشنا تھے کائنات میں خود کو ایک کلیدی رول پر مامور پاتے تھے۔ انہیں صاف محسوس ہوتا تھا کہ آخری ساعت تک دنیا میں جو کام بھی ہوگا اب متبعین محمدؐ کی حیثیت سے اس کی قیادت کا فریضہ انہیں انجام دینا ہے۔ تب خیر کا کام یا عمل صالح کا مفہوم ان تمام کاموں پر محیط تھا جس سے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود وابستہ تھی۔ قرآن نے محمد رسول اللہ کو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا تھا۔ پھر بھلا ان کے متبعین کے اعمال صالحہ سے عام دنیائے انسانیت کیوں کر متمتع نہ ہوتی۔

قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عمل صالح دراصل نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور اورادو وظائف جیسی شخصی عبادتوں سے بہت آگے کی چیز ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ان الـذيـن آمنوا و عملوا الصالحات و اقاموا الصلوٰة و آتوا الزكوٰة لهم اجـرهـم عند ربهم﴾ (بقرہ ۲۷۷)۔ نماز اور زکوۃ سے علیحدہ عمل صالح کا یہ مطالبہ جو قرآن اہل ایمان سے کرتا ہے اور جس حوالے سے یہ بشارت سنائی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس اجر موجود ہے، آخر ہے کیا؟ قرآن مجید نے مختلف اسالیب میں ایسے اہل ایمان کو جو عمل صالح سے متصف ہیں جنت کی بشارت دی ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿والـذيـن آمـنـوا و عـملوا الصالحات اولئك اصحاب الـجـنة﴾ (بقرہ ۸۲) بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر عمل صالح کے وہ حاملین بھی جن کا تعلق دوسرے ایمانی

طائفوں سے ہے مثلا یہود ونصاری اور صابئین تو ایسے خدا شناسوں اورفکر آخرت رکھنے والوں کو بھی عطائے ربی ﴿اجرھم عند ربھم﴾ اور ہر قسم کے خوف وحزن سے نجات ﴿لا خوف علھم ولا ھم یحزنون﴾ کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ گویا اہل ایمان‘ خواہ ان کا تعلق کسی بھی نبوی طائفے سے ہو‘ اگر وہ عمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو دنیا وآخرت کی کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن کے اس عمومی کلیے کی روشنی میں اگر ہم قومی مسلمان اپنا غیر جانبدارانہ محاسبہ کرسکیں تو اس سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ غلبہ واستیلاء کی قرآنی بشارت سے آج ہم محروم کیوں ہیں؟

قرآن کی اصطلاح میں عمل صالح ان تمام کاموں کو محیط ہے جو خدا کے نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو اور جس کے نتیجے میں نوع انسانی کو عام فائدہ پہونچے۔ شاہراہ عام سے کانٹا ہٹانے اور اسے عام انسانوں کی سہولت کے لئے صاف رکھنے سے لے کر نوع انسانی کو رشدو ہدایت سے ہمکنار کرنا، انہیں توہمات وسرکشی سے نجات دلانا اور ان کے لئے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے یکساں مواقع فراہم کرنا یہ سب کچھ عمل صالح کے دائرے میں آتا ہے۔ مؤمن جہاں عمل صالح یا مثبت خلاقانہ رویے سے معاشرے کی اصلاح و زیبائش میں لگا رہتا ہے وہیں کافر اپنے منفی رویے کی وجہ سے اس نظام عالم کو مسلسل زک پہونچانے کے فراق میں رہتا ہے۔ البتہ یہ کفار بھی اگر تائب ہوجائیں اور ایمان وعمل صالح کی راہ پر چل نکلیں تو یہ بھی کامیابی کی بشارتوں کے اتنے ہی حقدار ہوں گے۔ (قصص ۶۷)۔ قرآن میں بعض مقامات پر عمل صالح کو کفر کی ضد بتایا گیا ہے ﴿من کفر فعلیہ کفرہ و من عمل صالحا فلأنفسھم یمھدون﴾ (الروم ۴۴) جولوگ مثبت خلاقانہ رویے سے متصف نہیں ہوتے‘ جونوع انسانی کے قافلے میں عمل صالح کا اپنا حصہ ڈالنے سے اجتناب کرتے اور جن کی نگاہیں اپنے ذاتی یا قومی فائدے سے آگے نہیں دیکھ پاتیں ایسی قومیں اپنے اس منفی رویے کی وجہ سے کفر کے بہت قریب آجاتی ہیں۔ خلاقانہ قوتوں کا آبشار اگر خشک ہوجائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم عمل صالح کی مخالف سمت میں گامزن ہیں۔ ایسی قومیں دنیا کی امامت کی اہل نہیں رہتیں۔ بندر صفتی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ دوسری قوموں کی نقل میں ہی وہ اپنی عافیت جانتی ہیں۔ جیسا کہ اہل یہود جیسی برگزیدہ قوم کے ساتھ ہوا ﴿کونوا قردۃ خاسئین﴾۔

اس وقت دنیا میں انسانی زندگی کو نئی سمت دینے، معیار زندگی کو بلند کرنے، خدا کی کائنات کی تسخیر، خشکی، سمندر اور فضاؤں میں بہتر امکانات کی تلاش، رسل و رسائل کی سہولیات، سفر وحضر کی آسائشیں اور اس جیسے جتنے اعمال صالحہ بھی انجام پارہے ہیں بدقسمتی سے قومی مسلمانوں کا حصہ اس میں خاصہ کم ہے۔ اس

حقیقت سے شاید چشم پوشی مشکل ہو کہ موجودہ دور میں ہوائی سفر، ٹیلی فونی رابطے، ٹیلی ویژن، ریڈیو، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی ایجاد نے انسانی زندگی کو جس غلغلہ انگیز انقلاب سے دوچار کر دیا ہے اس کے نتیجے میں عام انسان کے لئے علوم و اطلاعات سے واقفیت حاصل کرنا ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ antibiotics کی ایجاد اور طب کے میدان میں جدید تحقیق نے بندگان خدا کے لئے بہتر زندگی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ کتنے ہی بے لوث اہل فن؛ جن کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں؛ انہوں نے عمل صالح کی اس مہم جوئی میں اپنی زندگیاں دے ڈالیں۔ جب ہی یہ ممکن ہوا کہ آج ہم اکیسویں صدی کی ابتداء میں سائبر اسپیس کے شہری کی حیثیت سے حقیقی دنیا سے بھی پرے ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کی پوزیشن میں ہیں جو اطلاعات کے غیر مرئی تاروں کے علاوہ کہیں اور وجود نہیں رکھتی۔ عمل صالح کے اس عالمی مشن میں مشرق سے افرادی قوت گاہے بگاہے ضرور ملتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عمل میں قومی مسلمانوں کی شرکت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ گزشتہ تین سو سالوں میں اس علمی اور اکتشافی معرکے کی قیادت ہمارے ہاتھوں میں نہیں رہی ہے اور نہ ہی راسخ العقیدہ مذہبی فکر نے اس عمل کو عمل صالح سے تعبیر کیا ہے۔

مسلم مذہبی حلقوں میں ابو حامد غزالی کے عہد سے تصوف کے زیر اثر فکر و نظر کا جو زوال جاری رہا اس نے ہمیں یہ باور کرایا کہ کائنات میں غور و فکر اور اس کی تسخیر کا کام وقت کا زیاں ہے۔ ہم اہل ایمان کا کام تو یہ ہے کہ ہم خود کو اوراد و وظائف میں مشغول رکھیں کہ مجاہدے کے بجائے مکاشفے کا راستہ ہمیں مشاہدۂ حق کی منزل مقصود تک لے جاسکتا ہے۔ ہم نے دانستاً اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔ قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو ان آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب و غریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہوجائے۔ لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور و فکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالے سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدارس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔ اسی طرح عمل صالح کے حوالے سے محیر العقول قسم کے اوراد و وظائف مسلم معاشرے میں رائج ہوگئے۔ کسی نے تسبیح ہزار دانے پر صبح و شام تمام کرنے کو عمل صالح قرار دیا تو کسی کو یہ غلط فہمی رہی کہ املی کے بیج پر سبحان اللہ و بحمدہ کا لکھوکھا وردامت کی مشکل کشائی کے لئے

مجرب ہے۔ ٹیکنالوجی کی مداخلت سے ایسے دستی آلے بھی اہل ایمان کے ہاتھوں میں دیکھے گئے جو وظائف کی گنتی الیکٹرونک طریقے سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ حالانکہ اس قسم کے لغو اور بے فائدہ عمل پر حضرت عمرؓ نے ابتدائی عہد میں ہی سخت تنبیہ کی تھی لیکن مختلف قسم کے علماء و مشائخ کے زیر اثر عمل صالح کے اس غیر قرآنی تصور نے ہماری راسخ العقیدہ فکر میں مسلسل اپنی جگہ بنائے رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں دوسری قوموں نے عمل صالح کے عالمی پروجیکٹ پر اپنا قائدانہ تفوق برقرار رکھا ان کی پیش قدمی مسلسل جاری رہی، وہیں ہم عمل صالح سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ مسلمانوں میں جو لوگ اس عمل میں اپنی ذاتی حیثیت سے شریک بھی ہوئے انہیں یہ احساس ندامت مسلسل کچوکے لگاتا رہا کہ شاید کشف و مجاہدے اور اورادو وظائف کی دنیا کو خیر باد کہہ کر انہوں نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ وہ اپنی آخرت کے سلسلے میں ایک طرح کے تذبذب کا شکار رہے اور شاید اس لئے کوئی بڑی کامیابی ان کے ہاتھ کم ہی آسکی۔

اعمال صالحہ کے سلسلے میں اس فکری مغالطے نے اگر ایک طرف تعقل پسند مسلمانوں کو سیکولرزم کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف مذہبی مسلمانوں کے لئے یہ مجبوری بن گئی کہ وہ ایک ایسی خیالی دنیا میں پناہ لیں جہاں تلخ حقائق ان کو پریشان نہ کرتے ہوں۔ زوال کی صدیوں میں صوفیانہ اسلام کی قبولیت، چلہ، گشت جیسی غیر اسلامی اصطلاحوں کا رواج اور کشف و مجاہدے پر زور دراصل اسی بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مسلمان اہل فکر اس سوال کا راست سامنا نہیں کرنا چاہتے کہ آخر اتنی بے شمار قرآنی بشارتوں کے باوجود آج ہم اہل ایمان کا حال اتنا پتلا کیوں ہے؟ حالانکہ اللہ کا صریح وعدہ ہے: ﴿ وعدالله الذين آمنوا منكم و عملوا الصالحات ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم ﴾ (النور ۵۵)۔ غلبہ و استیلاء کا یہ قرآنی وعدہ اسی دنیا کے لئے ہے۔ اس لئے محض یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ مؤمنین عزت و وقار کے لئے ایک دوسری زندگی کا انتظار کریں۔ وہ انصاف پرور خدا جو ذرے ذرے کے حساب کا قائل ہو جو ہر اچھے اور برے کام پر اجر کا وعدہ کرتا ہو ﴿ فمن يعمل مثقال ذرة خير يره ﴾ بھلا وہ اس بات کو کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ اعمال صالحہ میں مشغول قومیں تو حاشیہ پر رہیں اور خیالی دنیا میں نیک عمل کے دعویدار اقوامِ عالم کی قیادت پر متمکن ہو جائیں۔

۵

مسلم شناخت کی دھوپ چھاؤں

ویلفرڈ کینٹویل اسمتھ نے کوئی چالیس سال پہلے جب اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنی مسیحی مذہبی روایت کی پاسداری کے باوجود ایک سچے پکے مسلمان ہیں تو ان کے اس دعوے پر راسخ العقیدہ مسلم حلقوں میں خاصے حزم و احتیاط اور ذہنی تحفظ کا مظاہرہ کیا گیا۔ اسمتھ کا کہنا تھا کہ اسلام کوئی قومی یا ملی شناخت نہیں بلکہ عبودیت کاملہ کا ایک عملی رویہ ہے، سو جس نے بھی خدا سپردگی اختیار کی، اور اپنے آپ کو خدائے واحد کی غیر مشروط عبودیت میں دے دیا، اس نے اسلامی شناخت اختیار کرلی، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہبی طائفے، ثقافتی گروہ یا جغرافیے سے ہو۔ انہوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں یہاں تک کہا کہ انگریزی میں شاید میرے لئے یہ کہنا ممکن ہو کہ میں مسلمان نہیں ہوں کہ انگریزی زبان میں لفظ مسلم کے معنی ایک ایسی قوم کے ہیں جو متبعینِ مسیح سے مختلف مذہبی شناخت کی حامل ہے البتہ اسی بات کو میں عربی زبان میں اس طرح نہیں کہہ سکتا کہ لست بمسلم کہ عربی زبان میں ایسا کہنا خدا سپردگی سے انکار پر مبنی ہوگا جو مجھ جیسے مذہبی انسان کے لئے ممکن نہیں۔

اسمتھ کے اس دعوے کے سلسلے میں جس ذہنی تحفظ کا اظہار ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شاگرد رشید مشیر الحق، جنہوں نے مختلف مواقع پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسمتھ کی ان تعبیرات کی بھرپور وکالت کی، انہوں نے بھی ہر موقع پر اس خیال سے دوری بنائے رکھنے میں ہی عافیت

جانی۔ یہ سوال بحث طلب رہا کہ سچے متبع یا مسلم حنیف ہونے کی بنیادی شرائط کیا ہیں۔ فی زمانہ اسلام کا دعوے دار صرف قوم مسلم کا فرد ہوسکتا ہے یا اس سے باہر بھی متبع نفوس کا پایا جانا ممکن ہے۔ دیکھا جائے تو اسمتھ کا یہ دعویٰ اور اس سے پیدا ہونے والی بحث اسی قدیم فقہی اور کلامی بحثوں کا ایک جدید پرتو ہے جہاں کبھی یہ سوال معرضِ بحث رہا تھا کہ مسلمان ہونے کے لئے کون سی بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے، عمل یا عقیدہ؟

یہ سوال کہ مسلمان واقعی کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ ہمارے لئے محض کسی پرانی بحث کو زندہ کرنا نہیں بلکہ ایک ایسے بنیادی سوال کا محاکمہ کرنا ہے جس پر قومی مسلمانوں کے تصورِ حیات کا انحصار ہے۔

ایک فقہی ذہن جب قرآن مجید کے صفحات میں مسلم حنیف کی تعریف کی تلاش کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے کہ یہاں قانونی انداز کی تشریح و توضیح سے یکسر اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سارا زور اس بات پر ہے کہ انسان خدائے واحد کے آگے غیر مشروط سپردگی میں اس قدر محو ہوجائے کہ اسے اپنی ملی قومی شناخت نسلی اور جغرافیائی رشتے صبغۃ اللہ میں گم ہوتے ہوئے معلوم ہوں: ﴿ومن احسن من الله صبغة و نحن له عابدون ﴾ (بقرۃ: ۱۳۸)۔ قرآن مجید میں جابجا مختلف اسالیب میں اہل ایمان کے طائفوں کو گروہی اور مسلکی شناخت کو ترک کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کونوا ربانیین کی یہ دعوت اہل کتاب کے متحارب گروہوں کو مسلم حنیف بننے کی ترغیب دیتی اور ملت ابراہیم کی پیروی کی طرف بلاتی ہے۔ بعض مقامات پر صراحت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے کہ ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب اور اہل حق کے دوسرے خانوادوں کا تعلق نہ تو مروجہ یہودی مذہب سے تھا اور نہ ہی انہوں نے خود کو کبھی یہودی یا نصرانی کہلانا پسند کیا۔ مذہبی شناخت کے اس قضیے کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن نے یہ بات صاف کردی کہ طریقۂ براہیمی کی پیروی کرنے والوں کو خدا نے اطاعت شعاروں کی شناخت سے متصف کیا ہے۔ کونوا ربانیین اور صبغۃ اللہ کے تناظر میں دیکھئے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا جو اقوامِ عالم کا رب ہے اطاعت شعاروں سے ایک ایسے عالمی معاشرے کی تشکیل کا خواہاں ہے جہاں تمام مسلکی، ملی، جغرافیائی، نسلی شناخت پر اطاعت شعاری کا رنگ غالب آجائے۔

مسلمان کی تعریف کے تعین میں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن مجید میں امت مسلمہ کا تصور اہل ایمان کے مختلف طائفوں پر محیط ہے۔ دعائے براہیمی ﴿ وجعلنا امة مسلمة لك ﴾ تمام انبیائے سابقین کی باقیات اور ان کے سچے متبعین کو امت مسلمہ کا رکن رکین قرار دیتی ہے۔

رہے وہ لوگ جو ان انبیاء سے نسلی یا ملی تعلق کے باوجود راہِ سپردگی کو ترک کر چکے ہوں تو ان کے لئے خدا کا ارشاد ہے: ﴿لا ینال احد الظالمین﴾۔ گویا قرآن مجید کے مطابق مسلمان بنے رہنے کے لئے کسی مسلمان یا متبع گروہ سے صرف رسمی تعلق ہی کافی نہیں بلکہ عمل سے اس کی شہادت بھی لازم ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ خدا دعائے براہیمی سے ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیتا جو پیدا تو اہل حق کے طائفے میں ہوئے ہیں البتہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے اب وہ امت مسلمہ کی بشارتوں کے مستحق نہیں رہے۔

قرآن مجید نے مسلمان بنے رہنے کے لئے دین براہیمی کی پیروی، انبیائے سابقین کا اثبات، کتب، ملائکہ اور آخرت پر یقین کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ اہل ایمان تمام انبیائے سابقین کو خانوادۂ نبوت کا رکن مانتے ہیں اور یہ کہ وہ ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں۔ البتہ فقہ کی کتابوں میں مسلم حنیف کی تعریف چونکہ امت مسلمہ کے وسیع پس منظر کے بجائے امت محمدیہ کے تناظر میں متعین کی گئی ہے اس لئے یہاں مسلمان کی قرآنی تعریف پر گروہ مسلمین کی قومی شناخت غالب آگئی ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے مسلم قوم کے اندر پیدا ہونے والا ہر شخص خواہ فکر وعمل میں اسے ملت براہیمی سے کوئی نسبت ہو یا نہ ہو وہ اعلیٰ درجے کا مسلمان قرار پایا۔ جب کہ انبیائے سابقین کے طائفوں میں پائے جانے والے متبع نفوس بھی کافر کی حیثیت سے دیکھے گئے۔ بعد کی صدیوں میں اسلام کی آفاقی شناخت پر مسلم قومی شناخت کچھ اس حد تک غالب آگئی کہ مسلمانوں جیسا رہن سہن رکھنے، ان کے لباس و عادات کو اختیار کرنے اور ان کی معاشرت اور تہذیب کو بروئے کار لانے کو اسلام کا ہم معنیٰ سمجھا جانے لگا۔ ابن تیمیہ کے عہد تک آتے آتے صورتِ حال اتنی خراب ہوگئی کہ عربی زبان اور عرب تہذیب کو اسلام کا اصل الاصل قالب سمجھا جانے لگا۔ فارسی زبان کے بارے میں ابن تیمیہ جیسے متکلمِ اسلام نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فارسی زبان کا سیکھنا لوگوں کو نفاق میں مبتلا کردیتا ہے۔ یہ خیال ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا کہ نفاق اور کفر کا تعلق زبان اور تہذیب سے نہیں بلکہ قلب ونظر کے فساد سے ہے اور یہ کہ عہد رسولؐ میں منافقین کی جو کھیپ پائی جاتی تھی وہ سب عرب تہذیب کے ہی قالب سے اٹھے تھے، کسی فارسی یا اجنبی تہذیب کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ برصغیر ہند و پاک میں شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے یہاں عرب تہذیب پر غیر معمولی اصرار اور اسے اسلام کا اصل الاصل قرار دینے کی کوشش بھی دراصل اسی خلط مبحث کا اظہار ہے جو ایک آفاقی اسلامی شناخت کو مسلمانوں کے قومی شناخت سے متصف کرتی ہے۔

آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں جب امت محمدیہ صدیوں سے خود کو انحطاط میں مبتلا پاتی ہے اور

جہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے لئے اٹھنے والی پر جوش تحریکیں ہمیں کسی قومی احیاء سے دوچار کرنے میں بھی ناکام رہی ہیں اس بات کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ہم ان بنیادی سوالوں پر از سرِ نو غور کریں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ فلاح ونجات کی آسمانی دعوت جس کے سبب ہم کبھی اقوامِ عالم کے نجات دہندہ سمجھے جاتے تھے خود ہماری قومی بہبود کا سامان فراہم نہیں کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جو آخری پیغام کے امین ہیں انبیائے سابقین کے متبعین کی طرح صبغۃ اللہ کی تلقین کے بجائے لوگوں کو یہودی یا نصرانی بنانے پر مصر ہوں اور یہ کہتے پھرتے ہوں کہ نجات تو بس ہمارے گروہ سے جڑ جانے کا نام ہے۔ بھلا کسی ایسے قومی پروجیکٹ میں غیر اقوام کے لئے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟

عہد رسولؐ میں ہماری کامیابی ایک آفاقی تصورحیات اور بلند نگہی کے سبب تھی۔ محمد رسول اللہ کی دعوت پر لوگ ایک ایسی دنیا کے قیام کے لئے اٹھے تھے جس پر صرف صبغۃ اللہ کی چھاپ ہو۔ یہ لوگ اپنے وقت کے دوسرے لوگوں سے اگر ممتاز اور منفرد ہوگئے تھے تو اس کی وجہ ان کا تصور حیات تھا ورنہ لباس و معاشرت، زبان اور قبائلی نسبت میں وہ بھی اپنے عہد کے دوسرے لوگوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ البتہ قلب ونظر کی تبدیلی نے انہیں ایک ایسی بلند نگہی اور وسعت قلبی عطا کی تھی کہ وہ اپنے قومی اور ملکی مفاد کے بجائے اقوام عالم کی فلاح ونجات کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ گویا اسلام نے ان کے دلوں کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ اب اگر کوئی شخص تبدیلیٔ قلب و نگاہ کے بجائے صرف ان کے عادات و اطوار، لباس وتہذیب کو اختیار کرنے پر زور دے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس ظاہری اتباع میں محمد رسول اللہ کے متبعین کی پاسداری کررہا ہے یا اسی عہد میں ظاہری طور پر کچھ اسی طرح دکھائی دینے والے کفارانِ قریش کی۔ عہد رسول میں محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ شخص مذکور جھوٹی وفاداری اور جھوٹی شناخت سے منہ موڑ کر متبعین کے آفاقی معاشرے کے قیام میں منہمک ہوگیا ہے۔ متبعین محمد کے قدسی کارواں میں شمولیت کے لئے قلب ونظر کی یہ تبدیلی کافی سمجھی جاتی تھی۔ اسے نہ تو مسلمانوں کا سا لباس اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ کلمہ پڑھ کر کوئی نیا مسلمان نام رکھتا کہ اس وقت نہ تو مسلمان ناموں کی کوئی شناخت قائم ہوئی تھی نہ اسلامی لباس کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ ہی مروجہ معنوں میں تبدیلیٔ مذہب کے عمل سے لوگ واقف تھے۔ محمد رسول اللہ کے حلقۂ قدسی صفات میں داخل ہوجانے کے بعد بھی بظاہر وہ شخص ویسا ہی دکھائی دیتا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ البتہ اس کے اندرون کی دنیا بدل چکی ہوتی۔ تب قلب و نگاہ کی اسی تبدیلی کو ایمان کہتے تھے جس کی شہادت عمل کے ذریعے دی جاتی نہ کہ ظاہری تراش وخراش سے۔ نزول قرآن نے متبعین

محمد کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہی لوگ جو کل تک عرب وعجم کی عصبیت میں مبتلا تھے جن کے یہاں اپنے قبیلے کی بالا دستی کے لئے پشتہا پشت جنگوں کا سلسلہ چلتا اب وہی لوگ کونوا ربانیین کی آفاقی دعوت کے علمبردار بن گئے تھے۔

ابتدائی عہد کے مسلمان اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ حامل قرآن کی حیثیت سے دین براہیمی کا مستند فہم تو ان کے ہاتھ ضرور آگیا ہے البتہ انبیائے سابقین کے گروہوں میں متبع نفوس کے ایمان پر سوالیہ نشان لگانا ان کا کام نہیں۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ آنے والی تاریخ میں متبعین محمدؐ کے کلیدی رول کے باوجود دوسرے ایمانی طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کا رول کالعدم نہیں ہوگیا ہے بلکہ انہیں بھی اس نبوی تحریک میں اپنی اپنی بساط بھر شریک وسہیم ہونا ہے۔ مسلمان جب تک اس وسعت قلبی کے حامل رہے انہیں ربانی دعوت کے علمبردار کے طور پر دیکھا گیا۔ غیراقوام کے لئے اسلام کی آفاقی دعوت میں غیرمعمولی کشش رہی۔ البتہ جب عباسی بغداد میں عرب عصبیت کو سلطنت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور ریاست میں کلیدی عہدوں کے لئے صلاحیت اور صالحیت کے بجائے قومِ مسلم سے تعلق کو وجہ تفوق قرار دیا جانے لگا تو نہ صرف یہ کہ ہماری نظری بنیادیں متاثر ہوئیں بلکہ ہم اس بلندنگہی اور وسعتِ قلبی سے بھی خالی ہوتے گئے۔ اقوامِ عالم کی قیادت کے بجائے ہماری نگاہیں مسلم قومی افتخار کے پروجیکٹ پر مرکوز ہوگئیں اور ہم اہل کتاب اور دیگر اہل ایمان طائفوں کو حلیف کے بجائے حریف سمجھنے لگے۔ فکر ونظر کی اس تبدیلی میں صلیبی جنگوں کا بھی کسی حد تک دخل تھا جس نے وقتی طور پر فقہاء کے اندازِ فکر کو متاثر کیا۔ افسوس کہ اہل کتاب کی طرف بعض سیاسی عوامل کے تحت ہمارے رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اسے آگے چل کر دوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور آفاقی نقطۂ نظر سے دست برداری کے سبب دفاعی جنگ لڑنا ہمارا مقدر بن گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف عہد میں سیاسی اور تاریخی عوامل کے تحت مسلم تصور حیات میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں انہیں دائمی حیثیت عطا کرنے کے بجائے ان کا تنقیدی محاکمہ کیا جائے تب ہی اس قرآنی تصورِ حیات کی از سرِ نو تشکیل ممکن ہے جس کے بغیر ہم اقوام عالم کی قیادت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے:

۱۔ متبعین محمدؐ کی اصل الاصل شناخت صبغۃ اللہ سے عبارت ہے۔ اسلام تمام عالم انسانیت کو کونوا ربانیین کی دعوت دیتا ہے۔ محمدؐ رسول اللہ جو دینِ براہیمی کے سچے امین ہیں، کسی نئی امت کے قیام کے لئے نہیں آئے بلکہ آپؐ کا کام اسی دین براہیمی کا احیاء اور امت مسلمہ کی تشکیل نو ہے جو

قرآن مجید کی تعریف کے مطابق، تمام انبیاء صادقین اور ان کے سچے متبعین کو محیط ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں ولا و براء کا تصور متبعین اور منکرین کے مابین پائے جانے والے قطبین جیسے فرق کو واضح کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ متبعین محمدؐ دوسری قوموں کی طرح خود کو ایک قوم قرار دے ڈالیں۔ نظریے کی بنیاد پر اٹھائی جانے والی امت کسی قومی یا گروہی تشخص کی متحمل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی امت محمد یہ کے خول میں پناہ لینا اس کے اصل الاصل مزاج کا صحیح عکاس ہوسکتا ہے۔

۳۔ اہل کتاب کے سلسلے میں قرآن مجید کی بظاہر متعارض آیتیں ہمارے مفسرین کے لئے خاصی الجھن کا باعث رہی ہیں۔ ان تمام آیات کو مجموعی فضا میں سمجھنے کے بجائے بالعموم شانِ نزول کی روایتوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کے بجائے خود قرآن مجید کی عمومی فضا میں ان آیتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ہمارے خیال میں یہ تمام آیتیں متبعین محمدؐ کی قیادت میں انبیائے سابقین کے مجوزہ رول کا پتہ دیتی ہیں۔ آخری رسولؐ کی بعثت کے بعد قیادت پر تو یقیناً ان کے متبعین ہی فائز رہیں گے۔ ایسا اس لئے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے دوسروں کے مقابلے میں وہ اس بات کے کہیں زیادہ سزاوار ہیں۔ چنانچہ انبیائی تحریک کی سمت کے تعین میں انہیں اپنے جیسے راہ یابوں پر ہی انحصار کرنا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لاتتخذوا الأولياء من دون المؤمنين ﴾۔ رہی یہ بات کہ مسلمان بحیثیت قوم مجموعی طور پر انبیائے سابقین کے طائفوں کے سلسلے میں کسی سوءِظن کا شکار نہ ہوجائیں تو انہیں اس خیال سے باز رہنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ليسوا سواء من اهل الكتاب امة قائمة يتلون آيات الله آناء الليل وهم يسجدون ﴾۔ سیادتِ عالم کے منصب پر فائز قوموں کو یہ اندازہ تو ضرور ہونا چاہئے کہ اہل ایمان کے طائفوں میں سے کون ان کے لئے کتنا حامی و مددگار ہوسکتا ہے: جیسا کہ ارشاد ہے کہ ''اور ایمان والوں سے سب سے زیادہ دوستی کے قریب آپ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں''۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اہل یہود سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے کہ ﴿في قوم موسیٰ امة يهدون بالحق ﴾۔ انبیائے سابقین کے تمام گروہ ہماری اولین توجہ کے مستحق ہیں بلکہ سچ کہئے تو ہمارے پروگرام کا حصہ ہیں کہ ہمیں کلمۃ سواء کی بنیاد پر ان کے ساتھ اشتراک عمل کا پروگرام تشکیل دینا ہے۔ البتہ ہماری بلند نگاہی اور وسعت قلبی سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم انبیائے سابقین کی باقیات کو یا ان کی طرف سے پیش کئے جانے والے عملی منصوبے کو بغیر کسی تنقید و تجزیے کے قبول کرلیں گے۔ خود کو

انبیائے سابقین کی باقیات باور کرانے والے اگر کھلے عام کفر کا ارتکاب کرنے لگیں تو پھر اشتراکِ عمل کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے۔ کلمۂ سواء کی بنیاد پر تشکیل پانے والے پروگرام میں متبعینِ محمدؐ کو نظری، فکری اور عملی ہر طرح کی قیادت فراہم کرنی ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی میں دوسرے وثیقہ ہائے ہدایت کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اور نہ ہی رواداری کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان وحیٔ ربانی کے سلسلے میں کسی مداہنت کا شکار ہوں کہ رواداری اگر کسی مصلحت پسندی کے نتیجے میں ہوتو یہ ہمارے قافلے کو بے سمت کرسکتی ہے: ﴿ولن ترضیٰ عنك الیهود والنصاریٰ حتی تتبع ملتهم ﴾۔

۴۔ انبیائے سابقین کے باقیات ہوں یا موجودہ قومی مسلمان؛ اللہ کے نزدیک انہیں ایک دوسرے سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا ایمان اور عمل صالح ہے۔ وہ لوگ جو کافر قرار دئے جاتے ہیں وہ پیدائشی طور پر ایسے نہیں ہوتے۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کے ان کافروں کا تذکرہ ہے جن کی راہ یابی بیّنات کے نزول اور رسول کی بعثت کے بغیر ممکن نہیں ﴿لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب ﴾ یہود جنہیں تمام اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی گئی جب کفر و معصیت میں مبتلا ہوئے تو نہ صرف یہ کہ انہیں قیادت سے معزولی کا عذاب چکھنا پڑا بلکہ ان کی خلاّقانہ صلاحیتیں ماند پڑ گئیں۔ ایک طرح کی بندر صفتی ان کا قومی شعار بن گئی۔ خلاقانہ قوتوں کا آبشار خشک ہوگیا۔

ایمان سے کفر کا یہ سفر کھلے امکانات کا ایک ایسا دروازہ ہے جس میں افراد اور قومیں ہمہ وقت داخل ہوسکتے ہیں۔ دنیا میں جب بھی ایمانی معاشرے کا بگل بجایا جائے گا اس کے مخاطب نہ تو اہل یہود ہوں گے نہ عیسائی اور نہ ہی موجودہ دور کے قومی مسلمان بلکہ تمام عالم انسانیت اس آواز کی یکساں مخاطب ہوگی۔ پھر جو کوئی بھی خدا کی آواز پر لبیک کہتا ہوا آگے آئے گا وہ اس دور کے طائفۂ اہل ایمان کا مستند حصہ قرار پائے گا۔ خواہ اس کا تعلق ملی، جغرافیائی، نسلی یا دینی عتبار سے کسی بھی گروہ سے رہا ہو۔ ماضی میں محمدؐ رسول اللہ کے گرد قدسی نفوس کی جو کہکشاں سجی تھی اس میں حبشہ کے بلال، فارس کے سلمان، روم کے صہیب، مکہ کے مہاجرین اور یثرب کے انصار اپنی تمام سابقہ شناخت کو خیرباد کہتے ہوئے ربانیوں کے قافلے میں شامل ہوگئے تھے۔ فکر و نظر کے اس ہمہ گیر انقلاب نے یثرب کی چھوٹی سی بستی کو المدینة المنورة یعنی City of Enlightenment میں تبدیل کردیا تھا۔ آج بھی اگر متبعین محمد اپنی اس نظری شناخت کی دوبارہ بازیافت کرسکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود کو ایک نئے Enlightenment کے جلو میں نہ پائیں۔



اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تب ہم ایک آفاقی تصورِ حیات کے حامل تھے۔ اہل ایمان کے دیگر طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کو ہم اپنا فطری حلیف خیال کرتے ایسا اس لئے کہ قرآن مجید نے ان سے موالات اور سماجی رابطوں کی نظری اساس فراہم کردی تھی۔ قرآن مجید کی وہ آیات جن میں طعام اہل کتاب کو حلال کیا گیا ہے اور جن میں کتابیہ عورتوں سے مومن مردوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے، وحی کے دفتین میں آج بھی موجود ہیں لیکن فقہائے سابقین کے بعض فیصلوں نے ان احکام کو عملی طور پر معطل کر رکھا ہے۔

۶

مسلم ذہن کی تشکیلِ نو

جب سے میں نے ایلزابیتھ ورٹزل کی *Prozac Nation* اور پیٹر کریمر کی *Listening to Prozac* پڑھی ہے' ایک عجیب طرح کے مسرت آمیز استعجاب سے دوچار ہوں۔ پروزک، ریٹالین اور زولوفٹ جیسی کرشماتی دوائیں جن کے استعمال سے آج لاکھوں لوگ کامیاب زندگی جی رہے ہیں اور جن کے بارے میں خیال عام ہے کہ ان کے استعمال سے شکستہ دل انسانوں کو نئی زندگی جینے کا حوصلہ ملتا ہے' واقعی اگر اتنی ہی کارگر ہیں تو کیا ان دواؤں کو شکست خوردہ مسلمانوں کی تبدیلیٔ قلب ونظر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پروزک یا اس قبیل کی دوائیں بنیادی طور پر دماغ میں سیروٹونین (Serotonin) کی سطح میں اضافے کا کام انجام دیتی ہیں جس کی کمی سے انسان مایوسی، افسردگی، تشنج حتیٰ کہ اقدامِ خودکشی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ فی زمانہ کوئی ۲۸ ملین امریکی اس قبیل کی دواؤں کے سہارے معمول کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گویا دس فیصد امریکی باشندے ان کرشماتی دواؤں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ پھر اگر امریکی دنیا بھر میں غلبہ وتفوق اور کبر ونخوت جیسی نفسیات کے لئے جانے جاتے ہوں تو کچھ عجب نہیں۔

جدید دماغی علوم (Neuro Science) کا ارتقاء چونکہ بڑی حد تک مغرب میں انجام پایا ہے اس لئے فطری طور پر یہاں ان ذہنی امراض کے تدارک کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے جن سے مغربی معاشرہ دوچار ہے، مثلاً ڈپریشن، تشنج اور خودکشی وغیرہ۔ البتہ اگر دماغی علوم کا ارتقاء عالم اسلام میں ہوا ہوتا تو

شاید اس کی سب سے پہلی ترجیح یہ ہوتی کہ وہ مسلم ذہن کے اس کہنہ مرض کا علاج دریافت کرے جس میں یہ صدیوں سے مبتلا ہے اور جسے کانٹ (Kant) کی اصطلاح مستعار میں self-imposed immaturity کہا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں خود اعتمادی کا فقدان، یا مغرب سے ان کے مرعوب یا مبہوت ہوجانے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ آج وہ ساری دنیا کو اپنے خلاف برسرِ پیکار پاتے ہیں بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دانشورانہ اور روحانی ورثے کا، جس کے یہ امین ہیں، خود اپنے اوپر دروازہ بند پاتے ہیں۔ صدیوں سے انہیں اپنے دماغ کی قدر و قیمت اور کارکردگی کے سلسلے میں گمراہ کیا جاتا رہا ہے اس لئے آج دماغ کے استعمال کی ہر دعوت انہیں خلاف مذہب معلوم ہوتی ہے۔ جمہور مسلمانوں میں یہ خیال کم و بیش عقیدے کی حیثیت اختیار کرگیا ہے کہ متقدمین نے غور وفکر کا سارا کام انجام دے ڈالا ہے بقول اشرف علی تھانوی ''متقدمین کے اصول وقواعد اس حد تک کافی وشافی ہیں کہ قیامت تک کوئی ایسا مسئلہ پیش نہیں آسکتا جس کا جواز یا عدم جواز حتیٰ کہ جزئیات میں بھی ان اصولوں سے نہ نکل سکتا ہو'' (اشرف الجواب، اشرف علی تھانوی، ج ۲، ص ۳۱۲)۔ انسانی جسم میں رأس الاعضاء دماغ کی معطّلی کے اس عمل نے صدیوں سے امتِ مسلمہ کو عہد جاہلیت کی ذہنی کیفیت میں مبتلا کررکھا ہے جسے قرآن نے ﴿وجدنا آباء نا كذالك يفعلون﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

دماغ کی معطّلی کے اس فعل شنیع کو ہمارے متقدمین نے تقلیدِ سلف جیسی دلکش اصطلاحوں کا نام دے رکھا ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے وہ تمام مفکرین جو امت کی احیاء کے سلسلے میں سرتوڑ جدوجہد کرتے رہے ہیں انہیں بالآخر سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ صورتِ حال کی اس سنگینی سے بعض مصلحین اس قدر نالاں ہوئے کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ احیائے امت کی بیل منڈھے نہیں چڑھتی تو انہوں نے اپنا راستہ بدل دیا یا مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔ جب صدیوں سے مذہبی زندگی کی بزم دماغ کی معطّلی پر سجائی گئی ہو اور جب یہ باور کرایا جاتا رہا ہو کہ قرآن مجید سے راست اکتساب کا زمانہ لدگیا تو اس عقیدے کو بدل ڈالنا ایک ایسا لرزہ براندام خیال ہے جس کی اہل عموماً زوال پذیر امتیں نہیں ہوا کرتیں۔ ابوالکلام آزاد، جنہوں نے ابتدائے عمر میں حزب اللہ کے قیام اور اس کے منشور کی اشاعت کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی ساکت مذہبی زندگی میں ہلچل کی کیفیت پیدا کردی تھی، بہت جلد اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ مذہبی علماء کی مدد سے کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ محی الدین قصوری کے نام ایک خط میں انہوں نے اس خیال کا برملا اظہار کیا کہ جب تک ایک نیا مسلم ذہن تشکیل نہیں پاتا کسی تبدیلی کا خیال عبث ہے۔ آزاد کے

خیال میں نئے مسلم ذہن کی تشکیل کے لئے ایک بالکل ہی نئے قسم کے اسلامی لٹریچر اور نئی تربیت کی ضرورت تھی۔ محمد اقبال، جنہیں عصر حاضر میں اسلامی فکر کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ بھی جب یہ کہتے ہیں کہ غیابِ خلافت میں عرب امپیریلزم سے آزاد ہو کر اسلام کے آفاقی قالب کی تشکیل میں مدد مل سکے گی تو ان کی مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ قدماء کی تعبیرات سے ہٹ کر راست وحی کی روشنی میں غور وفکر کا ایک نیا ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔ اپنے خطبہ میں وہ اس بات کی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ عہد جدید کے انسانوں کو زندگی کی بدلی ہوئی صورتِ حال اور اپنے تجربے کی روشنی میں اسلام کے اساسی فقہی اصولوں کی ازسرِ نو تشریح وتعبیر کا حق دیا جانا چاہئے۔ جمال الدین افغانی اور ان کے متاثرین وتلامذہ بھی جب اجتہاد کی بات کرتے ہیں تو بنیادی طور پر وہ دماغ کے وظیفۂ عمل کی بحالی پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔ عبدہ رسالۃ التوحید میں تقلید کی مذمت میں یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں میں ماضی اور حال کی تمام نسلیں برابر کی حقدار ہیں، پھر یہ کیسا انصاف ہے کہ پچھلوں کو تو وحی ربانی سے اکتساب کا موقع ہو اور بعد کی نسلوں سے یہ حق چھین لیا جائے۔ اصولی طور پر روایتی مسلم فکر میں اس بات کی گنجائش تو موجود ہے کہ عامی اور عالم قرآن مجید سے اکتساب فیض کرے، اس میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھے۔ البتہ روایتی مسلم فکر میں اس بات کا پورا التزام کیا گیا ہے کہ وحی ربانی کی نئی تعبیر متقدمین سلف کی تعبیروں سے انحراف پر مبنی نہ ہو۔ یہ بات کوئی سمجھنے کو تیار نہیں کہ اگر ہماری ساری تعبیری کوششوں کا نتیجہ سلف کے فہم سے آگے نہیں بڑھتا یا الگ نتائج پیدا نہیں کرتا تو ایسے لایعنی غور وفکر کا حاصل ہی کیا ہے؟

گزشتہ چند صدیوں میں ہمارے یہاں زور وشور سے رجوع الی القرآن کی تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ مگر آج بھی رجوع الیٰ القرآن یا تمسک بالکتاب محض ایک نعرہ ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم قرآن کی طرف واپسی کے ہر خیال کو متقدمین کی طرف واپسی پر محمول کرتے ہیں۔ ہم موجودہ نسل کے انسانوں کو یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ وحی ربانی سے اپنی توفیق بھر راست اکتساب کر سکیں۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں سقوطِ خلافت کے پیدا کردہ نفسیاتی بحران میں جن لوگوں نے احیائے اسلام کی تحریکیں چلائیں انہوں نے خاص طور پر وحی ربانی کو اپنی توجہ کا موضوع بنایا۔ مصر میں سید قطب کی ''فی ظلال القرآن'' اور برصغیر ہند و پاک میں ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' اور امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' اسلامیوں کی خاص توجہ کا مرکز رہی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ان تفسیروں کے اثرات پوری دنیا میں اسلام پسند حلقوں پر پڑے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمسک بالکتاب کی یہ کوششیں اگر مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں

تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ تمام تفسیریں جن کے معاصرانہ اسلوب پر نئی تعبیری کوششوں کا گمان ہوتا ہے دراصل اپنے فہم اور منہج تعبیر میں متقدمین سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتیں۔ بھلا جب سب کچھ پرانا ہو تو نتائج نئے کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ نئی تفسیریں بھی قاری کو وحی ربانی پر راست غور وفکر کا راستہ دکھانے کے بجائے متقدمین کے طریقۂ تعبیر کا اسیر بنائے رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تیس سال اور پچاس سال قرآن مجید سے اشتغال رکھنے کے باوجود ہمارے مفسرین جہاں سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں بالآخر اسی نکتہ پر اپنا سفر ختم کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ہما شما کو تو چھوڑیئے جب ربع صدی اور نصف صدی کی طویل مدت تک قرآن سے اشتغال رکھنے کے باوجود کوئی شخص خود کو حنفی اور شافعی کے حوالے سے پیش کرے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کی تقلید پر خود کو مجبور پائے تو بھلا ایسے اشتغال کو دانشورانہ تضیع اوقات کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر ائمہ اربعہ یا ماضی کے دیگر فقہائے عظام منزل من اللہ نہیں تھے اور ان کے فقہی دواوین محض عامی یا کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ترتیب دیئے گئے ہیں تو بھلا ان اہل علم کو، جو قرآن مجید سے راست اکتساب کے دعوے دار ہوں اور جنہوں نے پچاس پچاس سال اس عمل میں لگایا ہو، کب زیب دیتا ہے کہ کتاب ہدایت سے راست واقفیت کے باوجود وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے فہم پر تکیہ کرنے پر خود کو مجبور پائیں۔ جب تک ہم اس اعتماد کے حامل نہیں ہوتے کہ خدا کی وحی میں متقدمین کی طرح ہمارا بھی اپنا حصہ ہے اور جب تک ہم اس بات کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں ہوتے کہ اگر متقدمین ہمارے فہم سے الگ تعبیر کا ایک منہج رکھنے کا حق رکھتے ہیں تو ہمیں بھی ان کی طرح اس بات کا حق حاصل ہے کہ ہم نئی دنیا میں نئے حالات کے تحت ان سے الگ طریقۂ تعبیر اختیار کر سکیں، تمسک بالکتاب کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آج اکیسویں صدی میں پیش آنے والے مسائل کا جتنا کچھ اندازہ ہمیں ہے یقیناً ہمارے متقدمین اس بارے میں اتنی آگہی نہیں رکھتے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اکیسویں صدی میں قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لئے ساتویں اور آٹھویں صدی کے اہل علم کو زحمت دی جائے جو نماز میں قصر کا حکم منزلوں کے تعین پر لگایا کرتے تھے جنہیں نہ تو کبھی خلائی راکٹ میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ اس بات کی خبر تھی کہ مشرق و مغرب کے دو غیر محرم انٹرنیٹ کی دنیا میں کبھی تخلیہ اختیار کر سکیں گے اور نہ ہی اس بات کی آگہی کہ ٹیلی مواصلات کے انقلاب اور ہوائی سفر کی عام سہولتوں کے باعث اکیسویں صدی میں دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہو جائیں گی۔

تمسک بالکتاب کی یہ دعوت جو دراصل سلف صالحین کی اتباع کی دعوت تھی امت میں زندگی کی نئی

روح پھونکنے میں ناکام رہی۔ سلف صالحین اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود ہماری طرح انسان تھے اور انسان ہونے کی حیثیت سے ان سے لغزشوں کے صدور کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ علمائے سلف کے اجتہادات کو اگر زمانی و مکانی پس منظر میں دیکھا جاتا اور اگر انہیں وحی ربانی کی آخری تعبیر یا حرفِ آخر کی حیثیت حاصل نہ ہوتی تو آنے والے دنوں میں علمائے متقدمین کی التباساتی لغزشوں کی اصلاح کا امکان باقی رہتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ سیاسی زوال کے سبب فتنوں کے خوف سے عام انسانوں سے غور وفکر کا حق سلب کرلیا گیا۔ ہوسکتا ہے وقتی طور پر اس اسٹراٹیجی سے امت میں انتشار فکری کو کنٹرول کرنے میں مدد ملی ہو۔ البتہ آگے چل کر رفع فتنہ کی خاطر اٹھائے جانے والا یہ قدم فی نفسہ ایک بڑا فتنہ بن گیا۔ آنے والی صدیوں میں صورتِ حال اتنی خراب ہوگئی کہ ہر متنازع مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ کیا جانے لگا اور یہ کہا جانے لگا کہ مسئلہ مذکور پر اجماع ہو چکا ہے لہذا اسے بحث کے لئے دوبارہ نہیں کھولا جاسکتا۔ حالانکہ کسی اجتہادی مسئلہ پر اجماع کے قیام کا خیال ایک انتہائی مہمل مغالطہ ہے جس پر کتاب وسنت، عقل اور تاریخ سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ بالفرض محال اگر کسی مسئلہ پر ماضی میں اہل علم کا اجماع ہو چکا ہو تو کیا اس موقف کا دوبارہ قرآن مجید کی روشنی میں تحلیل وتجزیہ نہیں کیا جاسکتا؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو موجودہ نسل کے مسلمانوں کے لئے قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کی معنویت کیا رہ جاتی ہے؟ کیا ہمارے لئے قرآن صرف ایک خاموش کتاب ہے؟ کیا خدا اکیسویں صدی کے مسلمانوں سے راست خطاب نہیں کرتا؟ کیا قرآن مجید کی یہ دعوت ہمارے لئے اب اپنی معنویت کھو چکی ہے کہ ہم جو ہدایت کے متلاشی ہیں وحی ربانی میں مسلسل غور وفکر کرتے رہیں ﴿افلا يتدبرون القرآن ام على قلوب اقفالها ﴾، اور کیا قرآن مجید جو پچھلوں کے لئے کتاب ہدایت تھی کیا ہمارے لئے صرف کتاب برکت ہے؟

﴿وجدنا آباء نا كذالك يفعلون ﴾ کا سحر انگیز قومی نعرہ جو کبھی لات وعزیٰ کی پرستش کو ایک دلفریب نظریے کے طور پر پیش کرتا تھا آج سلف صالحین کے حوالے سے اس بات کا داعی ہے کہ اکیسویں صدی کا انسان قرآن مجید سے راست اکتساب کا کوئی خطرہ مول نہ لے۔ آباء پرستی کی اس لَے نے' جو گزرتے وقتوں کے ساتھ مسلم دنیا میں مسلسل بڑھتی رہی ہے' سچ پوچھئے تو قرآن مجید کو اسلاف کی التباسات فکری کا اسیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ نئے دور کے لات وعزیٰ خشب وحجر سے تراشیدہ بے جان بت نہیں بلکہ وہ ائمہ متقدمین ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں تشریح وتعبیر کا وقیع کارنامہ انجام دیا ہے۔ وحی ربانی کی طرف ہمارے اس غیر عقلی رویے نے ہمارے لئے خدا کی زندہ اور لازوال وحی کو نہ صرف یہ کہ ایک منجمد

کتابِ سکوت میں تبدیل کردیا ہے بلکہ صدیوں سے کتابِ ہدایت سے محروم رہنے کی وجہ سے ہم من حیث الامۃ ایک بے سمت آوارہ روی کے شکار ہیں۔ ہمارے وہ مسائل جن سے ہم من حیث الامۃ ایک عرصے سے نبرد آزما ہیں ایک نئے طرزِ فکر کی شدید ضرورت کا احساس دلاتے ہیں لیکن ہم کسی قیمت پر بھی بند دماغی کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہیں۔ ذیل میں ہم چند مسائل کے اجمالی بیان سے یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ ایک نئے زاویۂ فکر اور ایک نئے مسلم ذہن کی تشکیل کے بغیر کوئی واقعی پیش رفت کیونکر ناممکن ہے۔

قضیۂ فلسطین

فلسطین کا مسئلہ گزشتہ پچاس برسوں سے حل طلب ہے۔ اگر ایک طرف متشدد مذہبی یہودی اس خیال کے حامل ہیں کہ ارضِ کنعان میں چار مربع فٹ چلنا انہیں جنت کا حقدار بنانے کے لئے کافی ہے تو دوسری طرف مسلمان جو صدیوں سے اس سرزمین کے باسی رہے ہیں اور جن کے قانونی استحقاق کو کسی طرح چیلنج نہیں کیا جاسکتا اگر اس بارے میں گفت وشنید سے انکاری ہیں تو ان کا موقف یہ ہے کہ ارضِ فلسطین فقہی اعتبار سے اراضیٔ وقف ہے اور وقف کی نوعیت چونکہ دائمی ہوتی ہے اس لئے اس بارے میں کسی مصالحت یا گفت وشنید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دونوں طرف بے لوچ موقف پر جم جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں سے بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کا اتلاف عام ہے جس میں یقیناً کمزور نہتے مسلمانوں کو نسبتاً بہت زیادہ قربانی پیش کرنا پڑ رہی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایسی اندھی گلی میں پھنس گئے ہوں جہاں آگے راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ جو لوگ ارضِ فلسطین سے سیکڑوں اور ہزاروں میل دور بیٹھے ہوں وہ یقیناً فلسطینی جانبازوں کو زبانی خراجِ تحسین پیش کرسکتے ہیں البتہ ان ماؤں بہنوں اور بیٹیوں سے پوچھئے جن کا ہر دن کوئی نہ کوئی قریبی عزیز یا تو ریاستی دہشت گردی کا نشانہ بن جاتا ہے یا اس کے سدباب کے لئے خودکش دھماکوں پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ مسئلہ فلسطین کا فی الوقت ممکنہ حل کیا ہوسکتا ہے اس بارے میں جب ہم نے مختلف علماء ومفکرین سے ان کی رائے جاننا چاہی تو اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اس مسئلہ کا دراصل کوئی حل ہے ہی نہیں۔ تو کیا انسانی جانوں کے اتلاف کا یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا؟ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے نازک لمحوں میں بارہا ایسی جنگیں لڑی ہیں جہاں انہیں strategic retreat کا راستہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ اگر مسلمان اس وقت ریاست اسرائیل سے براہ راست ٹکر لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو سرِدست اس مسئلہ کو التوا میں ڈالنا یا کسی مصالحتی فارمولے کو قبول کرنا ایک خالص قومی لڑائی میں

بھی قرینِ عقل رویہ قرار پائے گا' نہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے منتشر اور نہتّے گروہ غیرمنظّم جنگ میں اپنی جانیں گنواتے رہیں۔ لیکن کیا وقف اراضی کے سلسلے میں ایک مختلف نقطۂ نظر اختیار کرنا ممکن ہے؟ کیا امت کا اجتماعی مفاد اس بات میں پوشیدہ ہے کہ حکمت وحی کی روشنی میں مسئلہ کا ازسرِ نومحاکمہ کیا جائے اور ہم کم از کم ذہنی طور پر اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ اس مسئلہ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے غور وفکر اور محاکے کا موضوع بنایا جائے۔ کیا عجب کہ خدا ہمارے اجتماعی غور وفکر کے نتیجے میں ہم پر کوئی نئی راہ منکشف کردے۔ شرط یہ ہے کہ ہم دماغ کو حرکت دینے پر آمادہ ہوں۔

شیعہ سنی نزاع

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ آخری رسولؐ کی امت فکری طور پر دو مختلف خیموں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ تقسیم کے اس عمل کو ایسی فکری بنیادیں فراہم ہوگئی ہیں کہ اب ہمارے اہل فکر شیعہ سنی فرقے کے ارتکاز کو ایک نا قابل عمل خیال گردانتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری سے شیعہ اور سنی دھڑوں کا ارتقاء جن فکری بنیادیوں پر ہوا ہے ایسا سمجھا جاتا رہا ہے گویا اسلام کے یہ دو مختلف قالب من جانب اللہ ہوں۔ اگر ایک طرف سنی فکر میں ائمہ اربعہ کے بغیر مذہبی زندگی کا تصور ناممکن ہے تو دوسری طرف شیعہ فکر میں ائمہ معصومین و مامورین کے بغیر اسلام کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیعہ اور سنی دونوں فکر کو اصل اسلامی قالب سے انحراف پر صدیاں گزری ہیں۔ اس تاریخی سفر میں دونوں کی تصویریں ایک دوسرے سے مختلف مشخص ہوتی رہی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وحی ربانی میں راست غور وفکر کی ریت اگر دوبارہ قائم ہوسکے تو اس طویل فکری انحراف کی بساط لپیٹنا ممکن نہ ہو۔ دونوں طرف اگر اہل فکر مسلمانوں میں وحی کی لازوال روشنی سے استفادے کا رجحان عام ہوسکے اور اگر ہمارے اربابِ حل وعقد تاریخ کو وحی کا تابع کرسکیں تو اصولی طور پر صدیوں کے انحرافِ فکری کے خاتمے کی سبیل پیدا ہوسکتی ہے لیکن اس کے لئے بھی آباء پرستی کو ترک کرنا اور دماغ کو حرکت دینا پہلی شرط ہے۔

ائمہ اربعہ

مجموعی طور پر سنی فکر ائمہ اربعہ کی نسبت سے چار مختلف خیموں میں منقسم ہے۔ ماضی میں جب عباسی اور فاطمی سلطنتیں اسلام کے دورِ عظمت کا علامیہ سمجھی جاتی تھیں تو مختلف فقہی گروہوں کا آپس میں ٹکرانا، ایک دوسرے سے متحارب رہنا معمول کی بات تھی۔ اس باہمی خانہ جنگی اور مذہبی معرکے میں جانوں کا اتلاف

بھی ہوتا تھا۔عصر حاضر میں بھی جہاں مسلمانوں کو کوئی آزاد خطۂ زمین حکمرانی کے لئے میسر ہوا وہاں یہ سوال اہمیت اختیار کر گیا کہ یہاں کس فقہی مسلک کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوگی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سوال کی سنگینی نے مغربی سیکولرزم کے لئے راہ ہموار کی۔ طالبان کے افغانستان میں اہل ایمان کے دوسرے فرقے ذمّی کی نفسیاتی فضا میں جینے پر مجبور رہے۔مستقبل میں بھی جب کبھی مسلمانوں کو ایک آزاد خطۂ زمین حکمرانی کے لئے میسر ہوگا اسلامی اجتماعیت کی تشکیل میں یہ سوال پھر عود کر آئے گا کہ کس فقہی نظام کے تحت معاشرے کو منظّم کیا جائے۔ یہ کہنا کہ اکثریت کے مسلک کو سرکاری سرپرستی حاصل ہونی چاہئے اقلیتی فقہ کے حاملین کے لئے اس لئے قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ محض تعداد میں کمی انہیں اپنے اپنے خیموں کو خیر باد کہنے پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ یہ ان کے لئے عقیدے اور ایمان کا مسئلہ ہوگا۔عہدِ عباسی کی مسلکی خانہ جنگیاں اور موجودہ پاکستان میں مسلکی تشدد اسی خیال کی توثیق کرتے ہیں۔تو کیا عصر حاضر میں مسلم معاشرے کی تشکیل نو کے لئے ائمہ اربعہ سے ماوراء اسلام کا ایک آفاقی اور اجتماعی قالب تشکیل دنیا لازم ہوگا؟ ائمہ اربعہ اگر منزل من اللہ نہیں ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم فی زمانہ ان کے بغیر اسلام کو متصور کر سکیں؟ یقیناً یہ ایک انقلاب انگیز خیال ہے جس سے ایک بڑے تاریخی سفر کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔اگر ائمہ اربعہ کے ظہور سے پہلے اسلام کی مکمل اور تابدار تصویر پائی جاتی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس آفاقی تصویر کو وحی ربانی کے بنیادی وثیقے کی روشنی میں آج دوبارہ منقّح نہ کرسکیں۔اگر حرم مکی میں چار فقہاء کے الگ الگ مصلّے' جن پر کوئی پانچ صدیوں تک عمل جاری رہا' چند بدوی مصلحین کی کوششوں سے لپیٹے جاسکتے ہیں تو اکیسویں صدی کے مصلحین کی اجتماعی کوششیں ہمیں صدیوں پر محیط اس فقہی بحران سے نجات کیوں نہیں دلاسکتیں؟

تعالوا الی کلمۃ سواء کی دعوت

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہماری کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تب ہم ایک آفاقی تصورِ حیات کے حامل تھے۔ اہل ایمان کے دیگر طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کو ہم اپنا فطری حلیف خیال کرتے ایسااس لئے کہ قرآن مجید نے ان سے موالات اور سماجی رابطوں کی نظری اساس فراہم کردی تھی۔قرآن مجید کی وہ آیات جن میں طعام اہل کتاب کو حلال کیا گیا ہے اور جن میں کتابیہ عورتوں سے مومن مردوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے' وحی کے دفتین میں آج بھی موجود ہیں لیکن فقہائے سابقین کے بعض فیصلوں نے ان احکام کو عملی طور پر معطل کر رکھا ہے۔اب ہم اہل کتاب اور ان جیسے دوسرے ایمانی

طائفوں کو اپنا فطری حلیف سمجھنے کے بجائے انہیں کافر قرار دینے پر مصر ہیں۔ ہم اس خیال کے بھی قائل نہیں کہ دارالاسلام میں اسلام کے علاوہ دیگر سماوی مذاہب اور ان کے باقیات کو تمام تر مذہبی آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔ حالانکہ ابتدائی صدیوں میں جب ہماری دعوت لوگوں کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا رہی تھی اور اسلامی ریاست اپنی عظمت کے نصف النہار پر تھی عالم اسلام کے تقریباً تمام ہی بڑے شہروں میں مسلمان نہ صرف یہ کہ اقلیت میں تھے بلکہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں تمام تر سماجی اور مذہبی آزادی کے ساتھ خدائے لم یزل کی حمد وثنا سے معمور تھیں۔ تب ہم آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے خود کو تمام اہل ایمان طائفوں کا قائد سمجھتے اور کلمۃ سواء کی بنیاد پر ان کی حمایت کے حصول کو امر ربی خیال کرتے۔ اہل کتاب کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی، جس کی ابتداء عباسی بغداد میں ہوئی اور جس نے بعد کی صدیوں میں ایک جامد فقہی عقیدے کی حیثیت حاصل کرلی، قرآن کی آفاقیت سے مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہے۔

ایک نئی ابتداء کے لئے لازم ہے کہ ہم دیگر ایمانی طائفوں کے سلسلے میں قرآن کی روشنی میں اپنے فقہی رویے کا فی الفور محاسبہ کریں۔ شبہ اہل کتاب کے سلسلے میں بھی بعض سیاسی اور مذہبی عوامل کے تحت گفتگو کا دروازہ صدیوں سے بند ہے۔ خود برصغیر ہندو پاک میں اہل ہنود کے سلسلے میں البیرونی اور شہرستانی کے تحقیقی نتائج سے ہم نے یکسر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اگر اہل ہنود کے بعض طائفے شبہ اہل کتاب کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اگر ان کے یہاں بھی خدا، رسالت، آخرت، کتاب اور عمل صالح کا تصور پایا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں کلمۃ سواء کی بنیاد پر اسلام کے آفاقی مشن میں کھلے عام شرکت کی دعوت نہ دی جائے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں متحارب گروپ کے طور پر دیکھیں اور ان سے سماجی رشتوں کی بحالی، ان کے طعام کو اپنے لئے حلال اور ان کی عورتوں سے نکاح کو جائز نہ سمجھیں۔ فقہائے متقدمین نے بعض وقتی سیاسی عوامل کے زیر اثر کتابیہ عورتوں سے نکاح اور اہل کتاب سے موالات پر جو پابندی عائد کر دی تھی جب تک اسے ازسر نو تحلیل وتجزیہ کے لئے مباحث کی میز پر نہیں لایا جاتا ایک نئے رویے کی تشکیل ممکن نہیں۔

عہد عباسی میں منقح ہونے والے فقہی ذہن نے جس سے بعد کی صدیوں میں تقلید محض کا کام لیا جاتا رہا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام جیسے ابدی اور آفاقی دین پر عہد وسطی کا سماں طاری کر رکھا ہے۔ وہ دین جسے تاریخ کے آخری لمحے تک اقوامِ عالم کی سیادت کا کام انجام دینا تھا وہ اپنے متبعین کے غیر عقلی اور تقلیدی رویے کی وجہ سے جدید دنیا سے کنارہ کشی پر مجبور ہے۔ جہاں بھی اسلامی معاشرے کی ازسرنو تشکیل کا

غلغلہ بلند ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا عہد وسطیٰ کے سماجی منظرنامے کو پھر سے زندہ کیا جارہا ہو۔ غور وفکر پر مکمل پابندی لگانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کلیدی مذہبی اور سماجی ادارے آج وہ نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہیں جن کے تذکرے ہم قرونِ اولیٰ کی تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر قیامِ جمعہ جیسے بنیادی ادارے کو لیجئے جو بیک وقت عبادت بھی ہے اور جسے رشدو ہدایت کے حوالے سے اجتماعی زندگی کی تنظیم و ترتیب میں بھی اہم رول انجام دینا ہے۔ غیر عرب ممالک میں جہاں حنفی فقہ خطبہ کی زبان کے سلسلے میں متشدد موقف رکھتی ہے اور جہاں سامع کو عہد سلاطین میں لکھے گئے خطبوں کی سماعت پر اکتفا کرنا پڑتا ہے' خطبۂ جمعہ کا بنیادی وظیفہ معطل ہوکر رہ گیا ہے۔ خطیب کے سامنے جب مؤذن خطبہ کے لئے اذان دے رہا ہوتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ خطبہ کے اعلان کے بجائے ایک طرح کی رسمی خانہ پری کے عمل میں مصروف ہے۔ دورانِ اذان اس کے دائیں اور بائیں طرف گھومنے میں اب اس لئے کوئی معنویت سمجھ میں نہیں آتی کہ کل جب مدینہ کی مسجد میں مؤذن دائیں اور بائیں جانب گھومتا تو اس کا مقصد آواز کو مختلف جہتوں میں منتشر کرنا تھا اب یہی کام لاؤڈ اسپیکر سے لیا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مدینے کی وسعت بڑھ گئی اور لوگوں کا فی الفور اذانِ خطبہ سن کر جمع ہوجانا ممکن نہ رہا تو حضرت عمرؓ نے مسجد سے قدرے مسافت پر مقیم مسلمانوں کی سہولت کے لئے خطبہ سے کچھ پہلے ایک اور اذان کا اضافہ کردیا۔ قیامِ جمعہ کے بنیادی فوائد کے حصول کے لئے اگر حضرت عمرؓ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ایک اور اذان کا اضافہ کرسکیں تو کیا لاؤڈ اسپیکر کے مروّج ہوجانے کے بعد بھی دائیں اور بائیں سمت میں گھومنے کی ضرورت باقی رہے گی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر غیر عرب معاشروں میں جہاں عربی کے تحریری خطبوں کو نہ پڑھنے والا سمجھتا ہو اور نہ سننے والا' کیا عقل اور وحی کی روشنی میں عربیت پر اصرار کا کوئی جواز ہے؟ اس قبیل کی ایک اور مثال قمری مہینوں کے تعین میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں ہلالِ عید یا ہلالِ رمضان کی چشمی شہادت کو عقیدے کا مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں روز و شب کی گردش کو منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں ناپ لیا گیا ہو اور جہاں سورج اور چاند کے طلوع وغروب اور ظہور وغیوب کے بارے میں حتمی گوشوارے مرتب کرلئے گئے ہوں وہاں اگر اب بھی بعض قومیں عینی شہادت کے علاوہ دوسرے ذرائع کو یکسر مسترد کردیں تو ان کے بارے میں یہی تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ صدیوں کے تحقیق واکتشاف سے منہ موڑ کر اب بھی عہد وسطیٰ میں جینے پر مصر ہیں۔ سلفی دنیا جسے غیر مقلدین کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے وہاں بھی صورتِ حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ عید الفطر کے موقع پر ریاض، جدّہ اور دمام جیسے مدنی مراکز میں گیہوں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کے ڈھیر' جسے صدقۂ فطر کے طور

پر اہل ایمان غرباء میں تقسیم کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس بات کی چغلی کھارہے ہوتے ہیں کہ مذہبی ذہن اب بھی عہدِ وسطیٰ کے سماجی مظہر کو عبودیت کی تکمیل کے لئے لازم خیال کرتا ہے۔ سلفی علماء کے نزدیک صدقۂ فطر کی ادائیگی کے لئے قدیم پیمانے کے مطابق گیہوں کی ایک مخصوص مقدار مستحقین کو دینا لازم ہے۔ ایک صارف معاشرے میں جہاں مفلوک الحال انسانوں کو بھی پکی پکائی روٹیاں مل جاتی ہوں گیہوں کے یہ چھوٹے چھوٹے پیکیٹ لینے والے اور دینے والے دونوں کے لئے نہ صرف یہ کہ باعث زحمت ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن بنے رہنے کے لئے لازم ہے کہ ہمارا کوئی نفسیاتی یا روحانی رابطہ کسی نہ کسی حوالے سے عہد وسطیٰ سے برقرار رہے۔

اسلام کو عہد وسطیٰ کے تہذیبی ونفسیاتی قالب میں مجسم دیکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ امت محمدیہ کے درونِ خانہ بحث ومباحثے (Muslim Discourse) بڑی حد تک جدید دنیا سے غیر متعلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ مسائل جن پر ہمارے یہاں صدیوں سے بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے نہ تو بین الملی آفاقیت کے حامل ہیں اور نہ ہی ان سے جدید دنیا کا مستقبل وابستہ ہے۔ امت محمدیہ کے علمی حلقے، فقہاء کی مجلسیں اور دینی رسالوں کے صفحات ابھی ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں معتبر ہیں یا نہیں؟ مسلم عورت کو کشف وجہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فوٹو گرافی حلال ہے یا حرام؟ اور یہ کہ ٹیلی ویژن کے پردوں پر ابھرنے والی تصویر عکس ہے یا صورت گری؟ ان داخلی مباحث پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی ایسی امت کے موضوعات نہیں ہوسکتے جسے اقوامِ عالم کی سیادت پر فائز کیا گیا ہو۔ بھلا جو لوگ اقوام عالم کو درپیش مسائل سے منہ موڑ کر صدیوں سے ان مسائل میں الجھے ہوں جن سے دوسری اقوام کو نہ کوئی دلچسپی ہو اور نہ ہی جن سے دنیا کا مستقبل وابستہ ہو ان کا مقام تاریخ کا ٹریش کین (trash-can) تو ہوسکتا ہے سیادت کا مرکزی اسٹیج نہیں۔ پرانا طرزِ فکر اور پرانا دماغ کسی نئی ابتداء کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم دماغ کو متحرک کرنے پر آمادہ نہ ہوں ہمارے لئے اپنے مختلف الابعاد زوال کا صحیح ادراک کرنا بھی مشکل ہوگا۔ تدبر، تفکر اور تعقل کی قرآنی دعوت ایک ایسے ذہن کی تشکیل میں ہماری مدد کرسکتی ہے جو خود اعتمادی کے ساتھ اپنے بنیادی وظیفے میں لگ سکے۔ اگر ایسا ہوسکا تو ہم بآسانی اس نکتہ کو سمجھ سکیں گے کہ اکیسویں صدی میں پیش آنے والے مسائل کو ماضی کے فقہاء نے ہمیشہ کے لئے فیصل نہیں کردیا ہے اور یہ کہ وحی ربانی کی لازوال تجلی جس طرح پچھلی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے آج بھی ہماری رہنمائی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکتی ہے۔



اب تک تعبیری التباسات سے دامن بچانے کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ سنی اسلام کے مروجہ چار قالبوں کی تزئین و آرائش تک ہی محدود رہی ہیں۔ ہم اس بنیادی سوال سے اپنا دامن بچاتے رہے ہیں کہ کیا ان چار فقہاء کے بغیر کسی اسلامی زندگی کا تصور ممکن ہے؟ یہ وہ خیال ہے جس سے اصولی طور پر اتفاق کے باوجود عملی طور پر ہم اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر یہ چار فقہاء من جانب اللہ دین اسلام کی اساس نہیں بنائے گئے ہیں تو آخر ان کے ترک کرنے سے ہماری دینی زندگی کیوں کر منہدم ہو جائے گی؟ کیا ان مدونہ جامد فقہی دوادین کے بغیر کوئی واقعی اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا؟

۷

حقیقی اسلام کی حمایت میں

کرۂ ارض کی ڈیڑھ بلین سے زائد آبادی، جو خود کو محمد رسول اللہ کا متبع کہتی ہے، نظری طور پر اس خیال کی حامل ہے کہ وہ خیر امت ہے اور اسے تاریخ کے آخری لمحے تک اقوام عالم کی قیادت کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ مسلمان جس طرح خدا، رسول، ملائکہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح یہ بات بھی ان کے ایمان کا لازمہ ہے کہ منصب سیادت سے اہل یہود کی معزولی کے بعد اب انہیں انسانی تاریخ میں ایک کلیدی اور قائدانہ رول انجام دینا ہے۔ ایک طرف نظری طور پر اقوامِ عالم کی قیادتِ علیا کا دعویٰ اور دوسری طرف عملی دنیا میں ان کا انتشار اور پراگندگی۔ عقیدے اور عمل کے اس بُعد المشرقین نے مسلم ذہن کو صدیوں سے سخت تشنج سے دوچار کر رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہم اگر واقعی خیر امت ہیں تو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلے میں ہماری کمزوری اور انتشار اتنا نمایاں کیوں ہے۔ کیا یہی ہیں وہ برکات جو خیر امت کے حوالے سے ہمارے حصے میں آنی چاہئے تھیں؟

مسلم اہل فکر گزشتہ کئی صدیوں سے اس خیال کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ ہم من حیث الامۃ مسلسل زوال سے دوچار ہیں اور یہ کہ ہمارے تاریخی سفر میں کہیں کوئی بڑی گڑبڑی واقع ہوگئی ہے جس نے ہمیں مسلسل ایک سفر معکوس میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ماضی میں تجدید و احیاء کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں وہ فقط اس بات پر مرکوز تھیں کہ مسلم معاشرے میں اصلاح احوال کی جوت جگائی جائے۔ معاشرے کی اخلاقی حالت درست ہو۔ مذہبیت اپنے روایتی ثقافتی مظاہر کے ساتھ دوبارہ معاشرے میں جاری و ساری ہوجائے۔ گویا

زوال زدہ معاشرے پر مذہبی رسوم کا غازہ کچھ اس طرح مَلا جائے کہ بیمار معاشرہ کے چہرے پر وقتی طور پر زندگی کی رمق واپس آتی دکھائی دے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی وقیع کوشش ہوئی بھی تو بات یہاں تک پہنچی کہ مختلف فقہی خیموں سے وابستہ شخصیات اپنے اپنے فقہی مسالک کی روشنی میں غور وفکر کا فریضہ انجام دے لیں اور بس۔ یہ خیال ہمارے دائرۂ فکر سے باہر رہا کہ متوارث اسلام نسل بہ نسل اپنے اصل سے دور ہوتا گیا ہے۔ مختلف عہد کے علماء و متکلمین کی تعبیرات اور ان کی دانشورانہ مداخلتوں نے عہد بہ عہد اسے اس طرح متاثر کیا ہے کہ اب اسے اس کے اصل پر لوٹائے بغیر آگے کا راستہ خالص وحیٔ ربانی کی رہنمائی میں طے نہیں کیا جاسکتا۔ گوکہ اسلام کی تعبیر نو اور سرچشمۂ وحی تک واپسی کا خیال ہماری فکری تاریخ میں اجنبی نہیں تھا البتہ سنّی اسلام میں چار فقہاء کے تعین کے بعد عملی طور پر کسی پانچویں فقہ کے قیام کا راستہ بند رہا اور کتاب و سنت سے راست چراغ جلانے کی شدید خواہش کے باوجود ہمارے کبار مفکرین بھی ان چار فقہی دائروں سے باہر قدم رکھنے کی جرأت نہ کرسکے۔ اجتہاد فی الفروع یا اجتہاد فی المذھب کے دروازے تو یقیناً کھلے رہے البتہ اجتہاد فی الاصول یا اجتہادِ مطلق کے لئے اتنی سخت شرائط عائد کردی گئیں کہ ان پر کسی عام گوشت پوست کے انسان کا پورا اترنا ممکن نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم صورتِ حال کی اصلاح کا حوصلہ کھو بیٹھے۔ اس لئے کہ ہم سمجھتے تھے کہ اب کسی مجتہدِ مطلق کا ظہور ممکن نہیں۔ پچھلے غور وفکر کا تمام کام انجام دے گئے۔ ہمارا کام ان کے اقوال کی علت تلاش کرنا اور انہیں نئے مسائل پر منطبق کرنا ہے اور بس۔ ہمارا زوال جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔

تجدید و احیاء کا یہ عمل، جسے اب تک صرف مسلم معاشرے کی اصلاح تک محدود رکھا گیا ہے، اس خیال کا حامل ہے کہ مسلم معاشرہ اسلام سے اپنی دوری کے سبب زوال پذیر ہے اور یہ کہ اسلام سے دوبارہ اس کی وابستگی اسے پھر سے سیادت کے منصب پر فائز کردے گی۔ اس خیال کی صداقت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے۔ البتہ اصلاحِ احوال کی مساعی میں اس بات کی ضرورت کم ہی سمجھی جاتی ہے کہ موجودہ بیمار مسلم معاشرے کو اسلام کے نام پر جو دینی اور روحانی خوراک پلائی جاتی رہی ہے اور جس کے سبب قرنِ اول جیسے نتائج حاصل نہیں ہو پاتے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس روحانی اور دینی خوراک کا تعلق اس اسلام سے برائے نام رہ گیا ہے جو محمد رسول اللہ کے ذریعہ ساتویں صدی عیسوی کے مکہ میں آیا تھا۔ اس کے برعکس متوارث اسلام میں اجنبی خیالات، فقہاء و متکلمین کے التباسات، مفسرین اور متصوفین کی تعبیرات اتنی بڑی مقدار میں شامل ہوگئی ہیں جس نے وحیٔ ربانی کی تجلیوں کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو، جیسا کہ وہ محمد رسول اللہ کے ذریعہ آیا، اس کی اصل پر دوبارہ قائم کیا جائے تب ہی یہ ممکن ہے کہ ہماری دینی اور ملی زندگی قرنِ اول جیسے نتائج پیدا کرے۔ بالفاظ دگر یہ کہہ لیجئے کہ مسلم

معاشرے کی تجدید و اصلاح سے پہلے مصلحین کے لئے یہ لازم ہوگا کہ وہ متوارث اسلام کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائیں۔

مسلمانوں کے مابین مختلف فقہی گروہوں کا پیدا ہونا اور پھر فقہی مسلکوں کے اندر مختلف تعبیری اور جماعتی حلقوں کا قیام اس بات سے عبارت ہے کہ بادی النظر میں مسلم اہل فکر متوارث اسلام کی اصلاح کو ایک خیالِ عبث نہیں سمجھتے۔ بین المسلمین مختلف فکری دائروں کا وجود میں آنا اور ہر فرقے کو اس بات کی خوش فہمی کہ وہی فرقۂ ناجیہ ہے اسی خیال سے عبارت ہے کہ متوارث اسلام کے مختلف ایڈیشن ایک دوسرے کو دینِ اسلام کا حقیقی مظہر نہیں سمجھتے۔ البتہ متوارث اسلام کے سلسلے میں ان تمام شکوک وشبہات کے باوجود اگر ہمارا اس سے پیچھا نہیں چھوٹتا تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم متوارث اسلام کے تنقید و تجزیہ میں اپنے پسندیدہ مسلکی تعبیرات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ مثلاً اہل سلف کو لیجئے جو اس اعتبار سے تو ایک صحت مند رویے کی نمائندگی کرتے ہیں کہ فقہاء و متقدمین پر تکیہ کرنے کے بجائے کتاب وسنت سے راست اکتساب کیا جانا چاہئے البتہ سنت کی تعبیر میں بعض ائمہ محدثین کو وہ اپنے فہم کی کلید کچھ اس طرح تھماتے ہیں کہ اس پر تقلید آباء کا واضح گمان ہوتا ہے۔ ان کے اس رویے سے کتاب وسنت سے راست اکتساب کی امید اگلے ہی لمحہ دم توڑ دیتی ہے۔ اسلام کی تعبیر میں رسول اللہ اور ان کے صحابہ کرام کے اقوال و آثار سے بڑھ کر بھلا کس بات کو اعتبار ہوسکتا ہے لیکن تحلیل و تجزیہ کے مرحلے میں راوی کی ہر بات پر صرف اس لئے ایمان لے آنا کہ فلاں عالم یا محدث نے اسے ثقہ جانا ہے دراصل انسانی التباسات کو سند فراہم کرنا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے متقدمین خواہ وہ فقہاء ہوں یا محدثین اپنے بلند علمی مراتب کے باوجود وہ بھی بہر حال انسان تھے۔ ان سے تعبیری لغزشوں کے امکان کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔ وحیٔ ربانی کی تعبیر تاریخی حوالوں سے نہیں کی جاسکتی کہ تاریخ اپنی منتہا پر بھی وحی جیسی لازوال حتمی صداقت کا ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ متوارث اسلام کو اجنبی تصورات سے پاک کرنے کے لئے لازم ہوگا کہ ہم خالصتاً وحیٔ ربانی کی روشنی میں اسلام کے مختلف مروجہ قالب کا ناقدانہ جائزہ لیں۔ خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے پسندیدہ فقہی مسلک یا فرقے کی صداقت مشتبہ ہوتی ہوئی کیوں نہ معلوم ہو۔

اب تک تعبیری التباسات سے دامن بچانے کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ سنی اسلام کے مروجہ چار قالبوں کی تزئین و آرائش تک ہی محدود رہی ہیں۔ ہم اس بنیادی سوال سے اپنا دامن بچاتے رہے ہیں کہ کیا ان چار فقہاء کے بغیر کسی اسلامی زندگی کا تصور ممکن ہے؟ یہ وہ خیال ہے جس سے اصولی طور پر اتفاق کے باوجود عملی طور پر ہم اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر یہ چار فقہاء من جانب اللہ دین اسلام کی اساس نہیں بنائے گئے ہیں تو آخر ان کے ترک کرنے سے ہماری دینی زندگی کیوں کر منہدم ہوجائے گی؟

کیا ان مدونہ جامد فقہی دواوین کے بغیر کوئی واقعی اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا؟ اس سوال کا کوئی جواب فراہم کرنے سے پہلے لازم ہوگا کہ ہم فقہ کی ماہیئت اور حقیقت پر تنقیدی نظر ڈالیں۔ قرآنی دائرۂ فکر میں سوچنے والا ذہن اگر کل اپنے عقل وفہم کی روشنی میں کسی مسئلہ پر ایک رائے قائم کرسکتا تھا یا کئی مختلف فیہ رائے دی جاسکتی تھی تو آج انسانی ذہن، جس کا علمی افق ماضی سے کہیں زیادہ وسیع ہے، مسئلۂ مذکور پر کوئی مناسب رائے دینے کا اہل کیوں نہیں ہوسکتا؟۔ قرآن مجید میں تفکر، تدبر، تعقل پر جو غیر معمولی زور ہے کیا اس کی سزاوار صرف پچھلی نسلیں تھیں؟ خدا نے قرآن مجید نازل کیا اور اسے بیان للناس اور ہدی للمتقین قرار دیا۔ اس نے فقہاء کے دواوین نازل نہیں کئے۔ انسان اپنی سہولت کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق مرتب کرے جس کا وحی ربانی سے کوئی ٹکراؤ نہ ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں لیکن کسی ایسے ضابطہ اخلاق کو تقدس حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم خدا کی نازل کردہ کتاب کے ساتھ کسی انسانی تصنیف کو حصول ہدایت میں شریک کار نہ بنائیں۔ انسان کی ترتیب دی ہوئی کتابوں کو انسانی تصنیف کی حیثیت سے پڑھا جائے جس سے استفادہ بھی کیا جاسکتا ہو اور اختلاف بھی۔

ذہنی غلامی، خواہ اپنوں کی ہو یا غیروں کی، اس کی حیثیت ایک عذاب سے کم نہیں۔ اہل یہود جو کبھی اقوامِ عالم کی سیادت پر فائز کئے گئے تھے جب وحی ربانی کے بجائے علماء وفقہاء کی تعبیرات کے اسیر ہوگئے تو ان کے یہاں دین داری رسومِ عبودیت میں بدل گئی۔ خدا کی نازل کردہ کتاب تورات کے بجائے انسانی تعبیرات پر مشتمل تلمود ان کی مذہبی زندگی کا حوالہ بن گئی۔ علمائے یہود کی تعبیرات نے ان کی مذہبی زندگی کو اس طرح گرفت میں لے لیا کہ ان کے ہاں فقہائے یہود کی قیل وقال کے بغیر مذہبی زندگی کی تنظیم ناممکن ہوگئی۔ اس پر طرہ یہ کہ حلل اور شمائی کی فقہی موشگافیاں اور ربائی اکیوا کی تعبیرات کو تورات کا ہم پلّہ سمجھا جانے لگا۔ کہنے والے نے یہاں تک کہا کہ موسیٰ کے مقابلے میں تورات کا فہم ربائی اکیوا کو کہیں زیادہ ہے اور یہ کہ قیامت تک علمائے یہود تورات کی جو بھی تعبیر کریں گے وہ دراصل موسیٰ کو طور پر آنے والی وحی کا توسیعہ سمجھا جائے گا۔ خدا کی کتاب کے مقابلے میں انسانی تعبیرات کو تقدس مل جانے سے وہی ہوا جس کے سبب مامور امتیں معزول ہوجاتی ہیں۔ جب یہ خیال عام ہو کہ پچھلوں نے غور وفکر کا تمام کام انجام دے ڈالا ہے اور یہ کہ متقدمین کی فہم کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تو دل و دماغ کام کرنا بند کردیتے ہیں۔ ایسی قومیں نئی صورتِ حال میں نیا فیصلہ کرنے کے بجائے ﴿وجدنا آباءنا کذلك یفعلون﴾ کا ورد کرتی رہتی ہیں۔ تخلیقی قوتوں کا آبشار خشک ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر سبت کی حرمت کو لیجئے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اہل یہود اس دن کو خدا کے لئے خاص کرتے کہ عبودیت کا یہی تقاضہ تھا لیکن اس کے برعکس فقہائے یہود نے ایسے کاموں کی ایک طویل فہرست بنا ڈالی جو ان کے بقول دنیادارانہ امور پر مشتمل تھے۔ قدیم فقہ

یہود میں ان کاموں کی فہرست انتالیس تک شمار کی گئی ہے جو سبت کی حرمت کی پامالی کا سبب ہوسکتی ہیں۔ کہاں تو احتیاط کا یہ عالم کہ آج بھی جدید یہودی فقہ میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ یوم السبت کوٹوائلٹ فلش کیا جاسکتا ہے یانہیں۔بجلی کے بلب آن آف کئے جاسکتے ہیں یا نہیں۔اور کہاں فقہی حیل کے ذریعے انتالیس مذکور کاموں کے علاوہ دوسرے کاموں کے لئے فقہی جواز کی تلاش۔ فقہ کے سہارے غایتِ عبودیت کو شکست دینے کا فن کوئی ان سے سیکھے۔

اہل یہود جن کے ہاں علم و دانش کی وقیع روایت رہی ہے اگر وہ اپنی پیدا کردہ التباسات سے نکلنے میں ناکام رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ہاں فقہائے یہود کو ایک ایسا تقدس حاصل ہوگیا تھا جن پر سوالیہ نشان لگانا گویا دینِ موسیٰ پر سوالیہ نشان لگانے کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ دل و دماغ جب کام کرنا بند کردیں یا اسے دانستاً متقدمین کی غلامی میں دے دیا جائے تو ایسی قومیں تخلیق و ایجاد کا فن کھو دیتی ہیں۔ اب یہ صرف متقدمین کی غلامی نہیں کرتیں بلکہ حال کی دنیا میں بھی خود کو حاشیے پر رکھنے پر مجبور پاتی ہیں۔ان کے لئے ﴿کونوا قردة خاسئین﴾ کا فیصلہ صادر ہوجاتا ہے۔ بندر صفتی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اب وہ وہی کرتی ہیں جو غالب قوموں کو کرتا دیکھتی ہیں۔انہیں اپنے فرض منصبی کا احساس بھی نہیں رہتا۔

جب قومیں ﴿وجدنا آباء نا كذلك يفعلون﴾ کا ورد کرنے لگیں تو سمجھنا چاہئے کہ آگے راستہ بند ہے۔ کوئی سدِ سکندری ہے جو آگے حائل ہے۔ متوارث اسلام میں یہ قوت نہیں کہ وہ اس سدسکندری کو عبور کرسکے۔ ایسا اس لئے کہ یہ سدّ اس کی اپنی پیدا کردہ ہے' التباسات کی دھند التباسات سے نہیں چھٹ سکتی۔اس کے لئے تو لازم ہے کہ وحی ربانی کی براہ راست ضیاء پاشی ہو۔

متوارث اسلام بنام حقیقی اسلام

متوارث اسلام ایک ایسی تہذیبی روایت کا نام ہے جس کی اٹھان متبعین محمدؐ کے درمیان ضرور ہوئی البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اجنبی تصورات اس میں شامل ہوتے گئے۔کبھی دانش یونانی کے زیر اثر کلامی بحثوں نے جنم لیا تو کبھی کوہ نشیں عیسائی راہبوں اور تارک الدنیا فکر و فلسفہ نے اسے متاثر کیا۔ یہودی فقہاء اور قصاص کی حکایتیں بھی اس کے عوامی فہم کا حصہ بن گئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف انسانوں نے اپنے اپنے ذاتی رجحانات اور طبائع کے زیر اثر اسلام کے مختلف قالب تیار کر لئے۔کوئی اہل تصوف کہلایا تو کسی کو اہل ظاہر کا طعنہ سننا پڑا۔کسی نے سنت کی اتباع اور عشق رسول سے اپنی وابستگی کو ایسی مبالغہ آمیزی سے بیان کیا کہ بسااوقات اس پر شرک کا گمان ہونے لگا۔ دین مبین میں انسانی تفہیم و تعبیر کے مختلف رنگ شامل ہوجانے سے اسلام کے مختلف ایڈیشن وجود میں آ گئے۔متوارث اسلام کے یہ مختلف قالب وحی ربانی کے

بجائے انسانی تالیفات پر انحصار کرتے تھے۔ اسلام کے اتنے مختلف ایڈیشن کی موجودگی کا سبب یہ تھا کہ دین کی تشریح وتعبیر میں اب قرآن مجید کے بجائے معاون تالیفات کو کلیدی اہمیت حاصل ہوگئی تھیں۔ ہر فرقہ نے قرآن مجید کے بالمقابل مذہبی کتابوں کا ایک مجموعہ تیار کر رکھا تھا جس سے اس فرقہ کی شناخت ظاہر ہوتی تھی۔ مثلاً اہل حدیث کو کتب روایت کی کلیدی اہمیت پر اصرار تھا تو اہل تشیع کے یہاں دین کی کوئی تعبیر ائمۂ معصومین کے حوالے کے بغیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ سنی اسلام کے دوسرے گروہ کتب احکام اور کتب فقہ کو مذہبی زندگی میں رہنمائی کے لئے ناگزیر جانتے تھے۔ آگے چل کر جب مسلمانوں میں جماعت سازی یا شخصیات کی بنیاد پر گروہ بندی کا تصور عام ہوا تو ہر جماعت نے فہم دین کے لئے اپنے اپنے شیخ کی تالیفات کو کلیدی اہمیت دے ڈالی۔ قرآن کے بالمقابل مختلف انسانی قرآن وجود میں آجانے سے وحدتِ امت کا تصور پاش پاش ہوگیا۔ چونکہ فرمودات شیخ کو دین میں سند کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی اور شیخ کے تصور دین پر زباں بندی کو معتقدین ایمان کا حصہ سمجھ بیٹھے تھے اس لئے متوارث اسلام میں شیوخ کے التباسات فکری کے در آنے کا سلسلہ جو ایک بار چل پڑا تو شافعی سے لے کر اب تک اس سلسلے کو روکا نہ جاسکا۔ مثلاً ابو حامد غزالی کی تصنیفات جب پہلی بار منظر عام پر آئی تھیں تو ان کے تصور دین کی سخت نکیر کی گئی۔ اسلامی بلاد وامصار میں ان کی تصنیفات نذر آتش کی گئیں لیکن رفتہ رفتہ غزالی کی مخالفت کا زور کم ہوا اور صورتِ حال یہاں تک بدل گئی کہ اب وہی غزالی ہمارے درمیان حجۃ الاسلام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ متوارث اسلام کے متکلمین ہر دور میں ٹرین کے مسافر کی نفسیات سے دوچار رہے ہیں۔ ڈبے میں بیٹھنے والا ہر شخص پہلے تو ہر آنے والے کی مخالفت کرتا ہے پھر جب نیا مسافر کسی طرح اپنی جگہ بنا لیتا ہے تو وہ بھی نئے آنے والے کی مخالفت میں سب کا شریک بن جاتا ہے۔ انسانی تعبیرات والتباسات کے عمل دخل کا یہ سلسلہ متوارث اسلام میں کسی طرح بھی روکا نہیں جاسکتا۔

متوارث اسلام کے بالمقابل اسلام کا یہ تصور کہ اس کے مبادیات وحی ربانی کے صفحات میں قیامت تک کے لئے محفوظ ہیں، ہمیں انسانی فہم پر انحصار سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ حقیقی اسلام کے حاملین وحی ربانی کو ایک ایسے صحیفہ کے طور پر پڑھ سکتے ہیں جو عصر حاضر کے لئے نازل ہوا ہو اور جس میں موجودہ دور کے انسانوں کی رہنمائی کا مکمل سامان پایا جاتا ہو۔ یہاں متقدمین کے التباسات فکری ہماری راہ کا روڑا نہیں بنتے۔ ہم ان سے اکتساب فیض کو تو روا رکھتے ہیں البتہ ان کے فہم کو حرف آخر نہیں سمجھتے۔ متقدمین کے سلسلہ میں تمام تر عقیدت واحترام کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ﴿ تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون ﴾ (البقرة: ١٤١) ۔ حقیقی اسلام قرآن مجید کو تازہ بہ تازہ وحی کے طور پر پڑھتا ہے البتہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ تفہیم وتعبیر میں عہد رسول کے زمانی اور مکانی

پس منظر سے بے نیاز ہوسکتا ہے۔ عہد رسول جہاں وحی ربانی کو بہ کمال احسن برتنے کا سلیقہ سکھایا گیا ہمارے لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ ہم اس عہد کو سمجھنے میں وحی جیسے لازوال ماخذ کے مقابلے میں کسی دوسرے تاریخی مآخذ پر حتمی بھروسہ نہیں کرسکتے۔ چودہ صدیوں پر مشتمل متوارث علمی وتہذیبی ذخیرے کو یکسر قلم زد کرنا بھی سادہ لوحی ہوگی۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ حقیقی اسلام کی تلاش میں ہم مختلف ادوار کے التباسات فکری پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اس سے حتی المقدور اپنا دامن بچائے رکھیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم وحی کی روشنی میں متوارث اسلام کے بڑے بڑے شارحین، جنہیں بوجوہ تقدس کا حامل سمجھا جاتا ہے، کے بے لاگ محاکمے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

تیرہ صدیوں پر مشتمل عظیم تعبیری ادب کا محاکمہ اگر وحی ربانی کی روشنی میں کیا جاسکے تو یہ ہماری تاریخ کا ایک عظیم وقوعہ ہوگا۔ ہم ایسا محسوس کریں گے گویا ایک بار پھر عہد رسول کا اسلام ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہوگیا ہو۔ دنیا میں ساری بڑی تبدیلیاں خیالات کے سہارے آتی ہیں۔ خیالات میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ جس قوم کے پاس کوئی خیال نہ ہو اور جو صدیوں سے قدماء کی کتابوں پر حاشیہ در حاشیہ لکھنے کو علم کا معراج سمجھتی ہو اس کے لئے کسی نئی صبح کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ جہاں متوارث اسلام انسانوں کو فرقوں میں بانٹتا، شیوخ اور فقہاء کے خیموں میں منقسم کرتا، جماعتی اور گروہی ذہنیت کا اسیر بناتا وہیں حقیقی اسلام قرآن مجید کے بالمقابل تمام انسانی قرآنوں کے غیاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی صورتحال کے قیام کی دعوت دیتا ہے جہاں خدا کی کتاب کے علاوہ تمام انسانی تالیفات ناقابل اعتبار قرار پاگئی ہوں۔ تمسک بالکتاب کا واقعی حق اسی ماحول میں ادا ہوسکتا ہے۔

کوئی تیرہ صدیوں پر مشتمل تعبیری ادب کے محاکمے کے خیال سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہمارا مقصود محض کسی علمی تحریک کا برپا کرنا ہے۔ روایتی انداز کی علمی تحریکیں متوارث اسلام میں مزید رنگوں کے اضافے یا یا مزید التباسات کو جنم دینے کا سبب بنیں گی۔ وحی ربانی کے صفحات سے تازہ بہ تازہ اسلام کی ضیاء پاشیوں کے لئے لازم ہوگا کہ ہم وحی جیسے لازوال وثیقے کی عظمت سے آشنا ہوں اور ساتھ ہی ہمیں تاریخ کے موجودہ لمحے میں اپنی واقعی اہمیت کا بھی کسی قدر اندازہ ہو۔ ہم یہ سمجھتے ہوں کہ خدا نے ہمیں اس اعزاز کا سزاوار سمجھا کہ اپنی عظیم کتاب ہمارے لئے نازل کی۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی تمام تر تہی دامنی کے باوجود اس عظیم ہدایت سے اپنے فکر وعمل کی راہیں روشن کریں۔ کہاں خدا کا کلام اور کہاں انسان کا محدود فہم۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ خدا نے عام انسانوں کے لئے اس کتاب کو نازل کیا۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم تدبر و تفکر اور تعقل سے کام لیں اور یہ سب کچھ ایک ایسے زمانہ میں جب آخری پیغمبر کی رحلت پر کوئی چودہ صدیاں بیت چکی ہیں۔

جب خدا عام انسانوں سے براہ راست خطاب کرتا ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ عام انسان اس کی کتاب میں غور وفکر کریں تو ہمیں قرآن مجید کے راست مطالعہ سے آخر کیا چیز روکتی ہے؟ طبقۂ علماء کی موجودگی اور انہیں تقدس کا حامل سمجھنا جو متوارث اسلام کی امتیازی شناخت ہے دراصل ایک اجنبی اور غیر قرآنی خیال ہے جو یہود ونصاریٰ کی مذہبی ثقافت کے زیراثر عہد عباسی کی ابتدا میں ہمارے یہاں داخل ہوا اور بعد کے عہد میں پختہ تر ہوتا گیا۔ اللہ نے کسی انسانی گروہ یا طبقۂ مشائخ کو اس سرزمین پر اپنا نمائندہ نامزد نہیں کیا ہے اور نہ ہی رسول اللہ نے کسی خاص شخص، گروہ یا طبقہ کو اپنی نیابت سونپی ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے خلیفۃ المسلمین جیسے کلیدی منصب پر بھی اپنی حیات مبارکہ میں کسی کو نامزد کرنے سے احتراز کیا۔ سچ پوچھئے تو آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے پوری امت نیابت نبوی پر مامور ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کیتھولک چرچ کی طرح مسلمانوں میں بھی مذہبی پیشوائی اپنے ناجائز وجود کے احق ہونے پر اصرار کرے۔ پوپ، بشپ اور فادر کے مختلف مذہبی مناصب کی طرح سماحۃ الشیخ، فضیلۃ الشیخ یا اہل تشیع میں آیت اللہ عظمیٰ، آیت اللہ اور حجۃ الاسلام کے مدارج یا برصغیر ہندوپاک میں مولانا مدظلہ، حضرت مولانا اور حضرت جیسی اصطلاحیں آخر کس بات کی چغلی کھاتی ہیں۔ علماء ومشائخ لباس واطوار میں خواہ عام انسانوں سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ نظر آتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ حضرات آسمان سے نازل نہیں ہوئے ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کی تعبیرات کو تحلیل وتجزیہ کے بغیر قبول کرلیا جائے۔

متوارث اسلام کی بساط لپیٹنے، دین اسلام کو اجنبی تصورات سے پاک کرنے اور مدت سے بند کتاب کو از سرنو کھولنے کا عمل صرف مسلمانوں کو ان کی سیادتِ منصبی پر دوبارہ فائز نہیں کرے گا بلکہ اس سے پوری دنیائے انسانیت کے انتشار اور بے سمتی کے ازالے کی صورت پیدا ہوگی۔ متبعین محمدؐ نے جب سے سیادت عالم کے منصب سے اپنی معزولی کی راہ ہموار کی ہے انسانی تاریخ اپنے متعینہ راستوں سے دور جا پڑی ہے۔ تاریخ کے انحراف کی یہ درستگی ایک کائناتی وقوعہ ہوگی۔ جو کام اب تک بوجوہ نہ ہوسکا تھا اسے کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اب آسمان سے زمین کا رشتہ منقطع ہے اس لئے کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اسے فی زمانہ اسلام کے چشمۂ صافی سے سیراب کرنے پر مامور کیا گیا ہے کہ ایسا کوئی دعویٰ متوارث اسلام کا پیدا کردہ ہوسکتا ہے حقیقی اسلام کا نہیں۔



اسلام اور اسلام پسند

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب خدا کا آخری رسول ہمارے درمیان موجود تھا کسی کو یہ بات کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ وہ اسلام پسند ہے، تب فقط مسلم ہونا ایمان کے اعلیٰ ترین مدارج میں شمار ہوتا تھا۔ کسی کے لئے اس سے بڑا کوئی اور افتخار نہ تھا کہ وہ مسلم ہے یعنی ان لوگوں میں شامل جس نے اللہ واحد کے آگے غیر مشروط سپردگی اختیار کر رکھی ہے۔ اس وقت اسلام ایک ایسے دین کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا جو بشمول محمدؐ اور ان کے متبعین تمام انبیاء سابقین کا دین تھا اور مسلم ہونے کا مطلب گروہی شناخت سے عبارت ہرگز نہیں تھا۔ انبیاء سابقین کے وہ سچے متبعین جن کے قلوب خشیت الٰہی سے لرزتے اور جن کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں، انہیں قرآن نے اگر متبعین محمد کا فطری حلیف قرار دیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اسلام کو گروہی شناخت کے بجائے ایک عملی رویہ پر محمول کرتے تھے جس کی تصدیق خود دعویٰ کرنے والا اپنے عمل سے مسلسل کرتا رہتا تھا۔ جب تک اسلام کی یہ آفاقی تعبیر دنیا کے سامنے رہی، گم شدہ اور منحرف انسانیت کے قافلے اسلام کو اپنا نظریاتی مسکن و معدن تصور کرتے رہے، اسلام ایک نجات دہندہ تہذیب کی حیثیت سے انسانیت کی پناہ گاہ بنا رہا۔

بدقسمتی سے آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہاں اسلام سے کہیں زیادہ اسلام ازم کا غلبہ ہے۔ مسلمانوں میں ایک قابلِ ذکر طبقہ ایسے افراد کا پیدا ہو چلا ہے جو خود کو فقط مسلمان کہنے پر قانع نہیں،

اس کا اصرار ہے کہ اسے اسلام پسند کہا اور سمجھا جائے۔ بیسویں صدی میں مسلم معاشرے میں اسلام کو دوبارہ منشورِ عمل بنانے کے سلسلے میں جو مختلف قسم کی تحریکیں چلتی رہی ہیں جسے بالعموم اسلامی بیداری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس نے پوری دنیا میں بظاہر باشعور مسلمانوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا ہے جو خود کو اسلام پسند کہنے پر فخر کرتے اور اس لیبل کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں اسلام پسندوں کے ایک طبقۂ امتیاز کا پیدا ہو جانا یا امت مسلمہ کے اندر الگ سے کسی جماعت المسلمین کی ترتیب و تنظیم کے اسرار و عواقب کے سنگینی کا اب تک پورے طور پر ادراک نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بالعموم گزشتہ صدیوں میں مسلم معاشروں میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں کے نظری محاکے کے بجائے اسے محض ایک مستحسن اقدام کے طور پر دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں نے امت کو آج جہاں پہونچایا ہے وہاں کسی فکری مرکزیت کے بجائے فکری افتراق و انتشار کا سماں عام ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ہر ایک کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ اسلام کی اصل تشریح و تعبیر بس اس کے ہاتھ لگی ہے۔ رہے وہ اسلامسٹ جن کا کل فکری سرمایہ بیسویں صدی کے بعض شارحین کی تصنیفات ہیں تو وہ اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کہ اسلام کو منشورِ عمل بنانے کے لئے برسوں کی جدو جہد اگر مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر رہی ہے تو کم از کم اس پر تنقیدی نگاہ ہی ڈال لیں۔ فکری اور عملی انتشار کے اس دور میں جب کہ عام ذہنوں میں اسلام اور اسلام پسندی دونوں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا جاری زوال روکے نہیں رُک رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ روایتی انداز کا شور و غوغا جاری رکھنے کے بجائے ہم اپنے طریقۂ کار کا سخت تنقیدی محاسبہ کریں۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینی ہے کہ اسلام اور اسلام پسندی، جس پر بظاہر ایک ہی شئے کا گمان ہوتا ہے، دراصل اپنی ماہیئت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں اسلام ایک ایسا نظریہ ہے جو تمام عالم انسانیت کی حریت اور اس کے نجات کا علمبردار ہے وہاں اسلام پسندی قومی مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اسلام ان تمام سعید نفوس کا دین ہے جو خدائے واحد کی اتباع کا دم بھرتے ہیں اس کا کوئی تہذیبی اور ثقافتی قالب نہیں، یہ ایک ایسا کھلا دروازہ ہے جہاں شکست خوردہ انسانیت کے قافلے بلا امتیاز نسل و وطن تسکین و نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام پسندی یا اسلام ازم کی تحریک دراصل کلونیل عہد میں مسلم دانشوروں کے response سے عبارت ہے۔ خلافت عثمانی کے سقوط اور مسلم اکثریتی علاقوں پر

اقوام یوروپ کے سیاسی تسلط کے خاتمے کے لئے مختلف خطوں میں جوتحریکیں چلیں ان میں اسلام کا حوالہ پایا جانا فطری تھا۔ البتہ یہ تمام تحریکیں ایک استبدادی نظام کے ردِعمل کے طور پر سامنے آئی تھیں، اس لئے اس کے نظری اور عملی قالب اپنی مقامی ضرورتوں کے تابع تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلم ممالک سے استبدادی نظام کے خاتمے میں اسلام نے ایک کلیدی رول ادا کیا لیکن اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھے کہ استبدادی نظام کے خاتمہ کے لئے جوتحریکیں اٹھیں وہ عہد رسول کے اسلام کا مظہر تھیں تو ایسا سمجھنا محض خوش فہمی کہا جائے گا اور اس سے فکری التباس کی دھند مزید گہری ہوتی چلی جائے گی۔

اسلام پسندی کی تحریک کے صحیح محاکمہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس زمانی اور مکانی پس منظر کو بھی اپنی نگاہوں میں مستحضر رکھیں جس میں یہ تحریکیں وجود میں آئی تھیں۔ ہندوستان میں مولانا الیاس کی تحریک ایمان، ابوالاعلی مودودی کی دعوتِ حکومتِ الٰہیہ اور مصر میں حسن البنا اور سید قطب کی رجوع الی الاسلام کی دعوت، جسے آج عالمی سطح پر اسلام ازم کا سب سے منظّم اظہار سمجھا جاتا ہے، دراصل خلافت عثمانی کے سقوط سے پیدا ہونے والی محرومیوں کے سدباب کی مختلف النوع کاوشیں تھیں جن پر سقوط خلافت سے پیدا ہونے والے فکری اور سیاسی بحران کا سایہ پڑنا فطری تھا۔ ان حضرات کی یہ کوشش رہی کہ فی الفور مسلمانوں کا سیاسی ڈھانچہ کسی نہ کسی طرح قائم کردیا جائے۔ رہی یہ بات کہ خلافتِ عثمانی کا سقوط کیوں اور کیسے ممکن ہوا، کہ اجنبی اقوام ہماری سرزمینوں پر اس طرح قابض ہوتی چلی گئیں، تو ان خطرناک سوالات کو فرصت کے اوقات کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ مولانا الیاس کی تحریکِ ایمان نے چند مبادیات کو لے کر دیکھتے دیکھتے حیرت انگیز طور پر ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اسلام ازم کی تمام شکلیں خواہ ان پر سیاسی قالب کا گمان ہوتا ہو یا سیاست سے دور محض تزکیہ وتربیت کو وہ اپنا ہدف قرار دیتی ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تحریکیں اس آفاقی اسلام کی نمائندگی نہیں کرتیں جو عہد رسول کے اسلام کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف تصوف زدہ دینی تحریکوں میں ترکِ دنیا کا رجحان غالب رہا تو دوسری طرف اسلام کو سیاسی نظریے کے طور پر پیش کرنے والی تحریکوں نے اسلام کو ایک ایسے نظریہ کے طور پر متعارف کرایا جو مسلم قوم کے سیاسی غلبہ کو یقینی بناتا تھا یا کم از کم جو اقوام مغرب کے مقابلے میں مسلمان کی نظری پناہ گاہ تھا۔ ایک ایسا اسلام جسے مسلم قوم کے فکری قلعہ کی حیثیت حاصل ہو، جو اقوام مسلم کے سیاسی غلبہ کا زینہ سمجھا جاتا ہو، بھلا کسی ایسے اسلام میں دوسری قوموں کے لئے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی؟ پھر کچھ عجب نہیں اگر آج بھی اسلامسٹ آئیڈیالوجی کو اہل مغرب اپنے لئے موت کا سامان سمجھتے ہوں۔

ایک ایسے وقت میں، جب عالمی ذرائع ابلاغ میں ہماری تصویر مسخ کر دی گئی ہو، مسلم اہل فکر کے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ اسلام کو دوبارہ ایک آفاقی نظریہ کے طور پر کس طرح پیش کیا جائے جس میں تمام اقوامِ عالم اپنی نجات و فلاح کا سامان پاتے ہوں۔ آج مغرب میں جو لوگ تہذیبی جنگ کا بگل بجا رہے ہیں وہ غلط فہمیوں کی پیدا کردہ اس صورت حال سے حتی المقدور فائدہ اٹھانے کے لئے کوشاں ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک تہذیبی جنگ میں خود کو الجھانے کے بجائے ایک ایسے اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کریں جس میں تمام اقوام عالم کے لئے نصح و خیرخواہی اور نجات کی بشارت پائی جاتی ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں، بالخصوص مسلم ممالک میں، اسلامی بیداری کی تحریکیں جس طرح اسلام کو قومی سرمایہ کی حیثیت سے برتنے کی عادی رہی ہیں اور جس طرح اسلام پسند حضرات مسلمانوں کے مابین خود کو ایک باشعور طائفہ کے طور پر پیش کرتی رہے ہیں ان کے لئے فی الفور اپنے عمل کا محاسبہ کرنے اور آفاقی اسلام کے قالب کو تشکیل دینے میں کچھ وقت لگے گا۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران مصر، الجزائر، تیونس اور شام میں اسلامی تحریکیں قومی مسلمانوں سے نبرد آزما رہی ہیں۔ اسلام پسندوں اور روایتی مسلمانوں کے مابین اس معرکہ آرائی نے جس بڑے پیمانے پر عرصے سے کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں اب یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ مسلم معاشرہ میں اسلام کی بازیافت کا یہ طریقۂ کار شاید کچھ مناسب نہیں۔ الجزائر میں پہلے مرحلہ میں انتخابی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اسلام پسندوں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ یہ اس ملک کا آخری الیکشن ہے، اسلام پسندوں کے اقتدار میں آجانے کے بعد یہاں کسی الیکشن کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی، تو اس وقت اس قسم کے انتہا پسندانہ بیانات کے اسرار و عواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے چوک ہوئی۔ اسلام پسند مذہبی طائفے بالعموم اپنے ایمان کے آگے دوسروں کے ایمان کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی جو تشریح و تعبیر ان کے ہاتھ آئی ہے بس وہی احق ہے اور اس پر بزور بازو لوگوں کو عامل کرانے کے لئے وہ من جانب اللہ مامور کئے گئے ہیں۔ بیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کی رخصتی کے بعد مختلف دینی تحریکوں کو اسلام کی تعبیر کے سلسلے میں یہ غلط فہمی رہی اور جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اس کی جڑیں حال میں نہیں بلکہ ماضی بعید کے تہذیبی اور تعبیری ادب سے جا ملتی ہیں جس کے نقد و اصلاح کے بغیر مستقبل میں آفاقی اسلام کے قالب کی تشکیل ممکن نہیں۔

مسلمانوں میں کسی ایسے طائفہ کا پیدا ہو جانا جسے فقط اپنی تفہیم و تعبیر پر اصرار ہو اور جو دوسروں کی

فہم و بصیرت کو ہرگز خاطر میں نہ لاتا ہو کوئی نیا عمل نہیں ہے جس کے لئے صرف عہد جدید کے اسلام پسندوں کو مورد الزام سمجھا جائے۔ طالبان کے افغانستان میں جہاں ایک عرصہ بعد امیر المؤمنین کی اصطلاح کا احیاء ہوا اور مسلمانوں کو ایک امیر کی اتباع میں اسلامی زندگی جینے کا موقع فراہم کیا گیا وہاں اس بات پر شدید اصرار رہا کہ حلقۂ دیوبند کی حنفی تعبیر کے علاوہ کسی دوسری تفہیم وتعبیر کو ہرگز لائق اعتناء نہ سمجھا جائے۔ ان اسلامیوں کے زیر تسلط اہل قبلہ کے دوسرے گروہ سخت گھٹن کے شکار رہے۔ اسلامی بیداری کی تحریکیں اگر مسلم اکثریتی ملکوں میں بھی کسی اسلامی نظام کے قیام میں ناکام رہیں تو اس کا بنیادی سبب بھی یہی تھا کہ وہ قدیم اسلام ازم یعنی فقہی گروہ بندیوں کے ازالہ کے بجائے نئی فکری گروہ بندیوں کو جنم دے رہی تھیں۔ انہوں نے خوابیدہ فقہی گروہ بندیوں کو تو دبانے کی کوشش کی البتہ وہ غیر محسوس طور پر نئے فکری انتشار وافتراق کا سامان کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف اخوان المسلمین کی مرکزی تنظیم سے مختلف چھوٹی بڑی جماعتیں وجود میں آگئیں جنہیں محض اپنے فہم کی صداقت پر اصرار تھا اور جو اسے بزور بازو نافذ کرنا اپنا دینی حق سمجھتی تھیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ اسلام پسندوں کے ایک گروہ کے نزدیک دوسرا گروہ گمراہ قرار پایا اور متشددین نے ان کا خون مباح کرلیا۔

فی زمانہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین حیات وموت کا معرکہ برپا ہے۔ خاتمۂ دہشت کے عنوان سے مغربی اقوام کا افغانستان اور عراق پر قابض ہوجانا یقیناً ایک سنگین صورتِ حال ہے لیکن اس سے بھی کہیں خطرناک صورتحال یہ ہے کہ دنیا کو ہوس ملک گیری اور منظم امریکی دہشت گردی سے نجات دلانے کے لئے آخری رسول کے متبعین غیر موثر نظر آتے ہیں۔ کیا ہم اب بھی اس حقیقت کے ادراک سے آنکھیں بند کرسکتے ہیں کہ طالبان کے سقوط میں شمالی اتحاد نے کلیدی رول ادا کیا تھا اور عراق میں اجنبی اقوام کے قدم جمنے میں شیعہ وسنی کے مابین پائی جانے والی فکری خلیج نے بنیادی رول ادا کیا ہے۔ ہم اس تلخ حقیقت سے کیسے انکار کرسکتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سوتا ہمارے اندرون سے بہتا ہے۔ ہماری شکست کے محرکات ہمیشہ ہمارے اندرون میں پائے گئے ہیں سو جب تک اس اندرونی خلفشار کا علاج نہیں ہوجاتا' کامیابی کبھی بھی ہمارا مقدر نہیں بن سکتی۔

ہم من حیث الامۃ بیک وقت دو بڑے مسائل سے دوچار ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ مختلف جارح اقوام ہمیں منتشر اور پراگندہ حال سمجھ کر ہم پر حملہ آور ہوگئی ہیں لیکن اس سے کہیں بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم اپنے فکری انتشار کی وجوہات کے واقعی ادراک میں ناکام ہیں۔ ہم صدیوں پر مشتمل فکری پراگندگی کا قلع قمع

کرنے کی خود میں جرأت نہیں پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کا کوئی منصوبہ ابتدائی مراحل میں صرف اس لئے دم توڑ دیتا ہے کہ ہم فقہی خانوں میں مختلف طور سے صدیوں سے بٹے چلے آتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ہماری انحراف فکری کو ایک طرح کا اعتبار اور سند حاصل ہوگیا ہے جس کی تلافی کی کوئی کوشش ہمیں اب اجنبی معلوم ہوتی ہے۔

بھلا اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اسلام جو ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے' اس کی تفہیم و تکمیل کا تمام تر کام آپؐ کی حیات مبارکہ میں انجام پاچکا' اس کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے وہ انسانوں کی بنائی ہوئی تاریخ ہے۔ فقہاء کا ظہور، ان کی گروہ بندیاں، تشریح وتعبیر کی کتابوں کا لکھا جانا، غور و فکر کے لئے درس وارشاد کی مسندوں کا قائم ہونا یہ سب کچھ یقیناً مستحسن اقدام ہیں لیکن انہیں جزو دین نہیں قرار دیا جاسکتا۔ حیرت ہے کہ بعض سیاسی عوامل کی وجہ سے نویں صدی میں چار فقہی مسالک کو اعتبار مل جانے سے انہیں اب تعبیر دین کے کلید کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے بڑی حیرت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ جو امت دنیا کو الٰہ واحد کی بندگی کی طرف بلاتی رہی ہو، خود اس کی سب سے محترم مسجد حرم مکی میں نویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک بیک وقت چار فقہاء کے مصلے قائم رہے اور اس انتشار فکر وعمل پر کسی کی جبیں شکن آلود نہ ہوتی ہو، حالانکہ ان صدیوں میں ہمارے درمیان بڑے بڑے نابغۂ عصر علماء و مفکرین پیدا ہوتے رہے۔ تشریح وتعبیر کے بڑے بڑے علمبردار اور نہ جانے کتنے حجۃ الاسلام کو اس دوران امت نے جنم دیا لیکن امت کے اس فکری انحراف کی درستگی کا سہرا ان بادیہ نشیں نجدی قبائل کو جاتا ہے جنہوں نے بزور بازو ان تمام فقہی نمازوں کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو کئی صدی کے بعد کم از کم ایک مصلی پر جمع کردیا۔ اگر بادیہ نشیں نجدی قبائل محض اپنے ایک اصلاحی قدم سے حرم مکی سے مختلف فقہی مصلے لپیٹ سکتے ہیں تو عہد جدید کے باشعور مصلحین ہمارے فقہی تشتت کا خاتمہ کیوں نہیں کرسکتے۔ شیخ بلقینی کہتے ہیں انہوں نے اپنے عہد میں اپنے استاد سے پوچھا کہ ہمارے عہد کے فقہاء خود کو چار فقہاء میں سے ہی کسی ایک کا خود کو پروردہ کیوں گردانتے ہیں، وہ اپنی علیحدہ فہم وبصیرت کا اعلان کیوں نہیں کرتے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے مناصب پر تقرری کے لئے انہی چار مدرسۂ فکر میں سے کسی ایک کا عالم ہونا ضروری سمجھا جاتا ہو، بلقینی کہتے ہیں شیخ یوسف مسکرائے اور انہوں نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ جب تک فکری تشتت کی صورتِ حال پر ہمارے اہل فکر محض تبسم فرماتے رہیں گے اصلاحِ احوال کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔

۹

اسلام میں ’چرچ‘ کے انہدام کی ضرورت

اسلام میں ہر شخص خود ہی اپنا پوپ ہے اور اسے خود اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ خدا سے راست تعلق قائم کر سکے۔ اس بات سے مسلم اہلِ فکر ہی نہیں بلکہ عوام بھی بخوبی واقف ہیں کہ اسلام میں کسی مذہبی پیشوائی کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ ہی کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اہلِ زمین کے سامنے خود کو خدا کا نمائندہ یا رسول کے نائب کی حیثیت سے پیش کرے کہ یہاں پوری امت مسلمہ نیابتِ نبوی کے فریضے پر مامور ہے۔ البتہ نظری طور پر کسی مذہبی پیشوائی کے انکار کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے مابین عرصہ ہوا ایک نامحسوس چرچ رفتہ رفتہ وجود میں آتا گیا اور عملاً ہوا یہ کہ قرآن مجید کی تشریح وتعبیر پر طبقۂ علماء نے مختلف حوالے سے اپنا حق محفوظ کر لیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا، اس عمل کو سمجھنے کے لئے ہماری علمی اور تہذیبی تاریخ میں در آنے والے انحرافات کو سمجھنا لازم ہوگا۔ البتہ ہم یہاں صرف چند امور کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔

ابتداء میں قرآن مجید کو ایک رہنما کتاب کی حیثیت حاصل تھی جسے ہر خاص و عام اپنے غور و فکر کا مستحق سمجھتا تھا۔ صحرائے عرب کے بادیہ نشینوں کے لئے عربی مبین میں نازل ہونے والی اس کتاب کی حیثیت بیان للناس کی تھی۔ رہی وہ باتیں جن کے بارے میں اس کتاب میں کوئی صریح رہنمائی نہیں پائی جاتی تھیں؛ تو ان مسائل پر پہلی نسل کے مسلمان انصاف کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی فیصلہ پر

پہنچ جاتے تھے۔ بسااوقات ان فیصلوں میں اختلاف بھی پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں عہدِ رسولؐ اور عہدِ ابو بکر کے بعض فیصلوں پر نظر ثانی کی گئی۔ مثال کے طور پر مالِ غنیمت کی تقسیم یا تألیف قلب کے لئے دی جانی والی رقم کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے اپنے پیش رووٴں سے مختلف راستہ اختیار کیا اور اسے وہ بدلے ہوئے حالات میں زیادہ قرینِ انصاف سمجھتے رہے۔ بعض مسائل ایسے بھی تھے جن کی کوئی نظیر عہدِ رسول میں پائی جاتی تھی اور نہ ہی اس قسم کے مسائل ابتدائی خلفاء کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے ان مسائل پر عقل کی روشنی میں فیصلہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ابتدائی عہد میں جب مسلمان کسی مسئلہ پر فیصلہ کرنے کے لئے پچھلی نظیروں کو دیکھتے تھے تو اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ معاشرے میں مروّجہ ان اصولوں سے استفادہ کیا جائے جن میں انصاف کی ضمانت مل سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ 'سنن' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا تھا یعنی ایک ایسا معروف طریقۂ کار جو معاشرہ میں رائج رہا ہو اور وہ قرینِ انصاف بھی ہو۔ گویا رائے یا عقل کا استعمال ابتدائی ایام میں اہل فکر مسلمانوں کے مابین عقل سلیم کے استعمال سے عبارت تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عقل کا یہ استعمال قرآن مجید کے اس بنیادی فکری ڈھانچہ کے اندر ہی ہوا کرتا تھا۔ البتہ اہل علم اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ جہاں عقل ان کی واضح رہنمائی کرسکتی ہو، انہی امور کو مزید سند بخشنے کے لئے وہ متقدمین کے اقوال بھی تلاش کریں۔ پہلی صدی کے آخر تک اہل الرائے ہونا تدبر وتفکر کی علامت تھی۔ البتہ دوسری صدی کی ابتداء سے عمر بن عبدالعزیز کی ایماء پر اقوال و آثار کی تدوین نے اس خیال کو تقویت دی کہ مسائل پر قرآنی فریم ورک میں محض عقل کی روشنی میں غور کرنے کے بجائے اگر اقوال وآثارِ رسول اور صحابہ سے بھی مدد لی جائے تو شاید ہمارے فیصلے حق سے زیادہ قریب ہوسکتے ہیں۔ اس خیال نے اہل الرائے کے مقابلہ میں اہل الحدیث کے ایک گروہ کی شناخت قائم کی۔ ثانی الذکر اس خیال کی شدت سے تبلیغ کرتا رہا کہ انسانی عقل کے مقابلہ میں رسول اللہ سے منسوب ایک ضعیف قول کو بھی کہیں زیادہ اہمیت دی جانی چاہئے کہ آخر یہ ٹھہرا تو قولِ رسول۔ علمائے حدیث پر مشتمل اس گروہ نے اہل الرائے کو اہل الھوی والبدعۃ سے تعبیر کیا۔ دیکھتے دیکھتے تیسری صدی تک مسند امام احمد بن حنبل کے وجود میں آنے کے بعد کوئی چالیس ہزار احادیث پر مشتمل ایک ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوحنیفہ، جنہیں اہل الرائے کا سرخیل کہا جاتا ہے، ان کے حیطۂ علم میں صرف سترہ حدیثیں ہی آ سکی تھیں اور اس لئے وہ مختلف امور میں رائے زنی کے لئے اپنی عقل کو مہمیز کرنے پر مجبور تھے۔

قرآنی دائرۂ فکر میں غور وفکر کے بجائے اقوال و آثار کی تلاش میں لگ جانے سے عملاً ہوا یہ کہ انسانی مسائل پر غور وفکر کرنا اور اس بارے میں کسی قرین انصاف رائے پر پہنچنے کا کام عام انسانوں کے بس سے باہر ہوگیا۔ خدا کی کتاب تو اب بھی موجود تھی لیکن لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔ مسلم اہل فکر اب یہ سمجھنے لگے تھے کہ قرآنی الفاظ کی تشریح وتعبیر کی کلید ان اخبار و آثار میں ہے جو لامحدود ہیں اور جن پر اب صرف متخصصین ہی کچھ کہنے کے پوزیشن میں ہیں۔ آگے چل کر لوگوں نے امورِ دین پر لب کشائی کے لئے سخت شرائط عائد کردیں۔ کسی نے کہا کہ فتویٰ دینے کے لئے لازم ہے کہ مفتی کو کم از کم تین لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہوں۔ کسی نے کہا کہ صرف 'مبسوط' کا زبانی یاد کرنا بھی کسی شخص کو دینی امور میں رہنمائی کے لائق بنا سکتا ہے۔ البتہ ان تمام باتوں میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب قرآن مجید عام انسانی غور وفکر کے دائرے سے باہر کی چیز سمجھا جانے لگا تھا۔ جب تک اقوال و آثار، تاریخ وتفسیر، ناسخ ومنسوخ جیسے علوم پر قدرت نہ ہو، قرآن مجید سے راست اکتساب ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ اس خیال نے بہت جلد دین اسلام پر متخصصین کی گرفت مضبوط کردی اور یہ خیال عام ہوگیا کہ، بقول شافعی، ان مسائل کی حقیقت اب صرف الراسخون فی العلم کو معلوم تھی۔ رہے عام انسان تو الرسالہ کے مصنف نے انہیں اس بات کا مکلّف قرار نہیں دیا کہ وہ مسائل کی ان باریکیوں کو سمجھنے اور اس بارے میں رائے قائم کرنی کی زحمت گوارہ کریں۔

قرآن مجید جیسا کہ محمد رسول اللہ پر نازل ہوا تھا اپنی اصل حالت میں آج بھی موجود ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت اس کی تلاوت کی اجازت دیتی ہے' تفہیم کی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی خاص مسئلہ کے سلسلہ میں حتمی رائے پر پہونچنے کے لئے اولاً قرآن مجید' ثانیاً آثار واقوال' ثالثاً اجماع اور رابعاً قیاس سے کام لیا جائے۔ حالانکہ قرآن مجید کے متعین متن کے علاوہ تعبیر وشرح کے بقیہ تینوں مآخذ انسانی فہم کے کارفرمائی کے باعث باعثِ نزاع رہے ہیں۔ فقہاء کا باہمی اختلاف احادیث کے سلسلہ میں ان کا مختلف فیہ ہوجانے کی وجہ سے ہے اور ان میں سے ہر ایک کا قیاس جسے مختلف فقہی اصطلاحوں مثلاً مصالح مرسلہ، استحسان جیسے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے' دراصل ان کی اپنی فہم کا ماحصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود تیرہ صدیوں پر مشتمل تعبیری ادب میں ایسی آراء کی کمی نہیں جو ہیں تو نزاعی البتہ ان پر اجماع کے انعقاد کا دعویٰ کیا جاتا رہا ہے۔ کہنے والوں نے یہاں تک کہا' جیسا کہ حنبلی فقیہ ابن عقیل کی رائے ہے' کہ قرآن کے متن کے مقابلہ میں اجماع کہیں زیادہ قابل قبول ہے' اس لئے کہ متن کے بارے میں' بقول ان کے' تو یہ

خیال رہ سکتا ہے کہ شاید اس آیت کی تنسیخ کرنے والی کوئی دوسری آیت موجود ہو جب کہ اجماع نا قابل تغیر وتبدل ہے جس کی صحت کے سلسلہ میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اندازِ فکر نے قرآن مجید پر راست غور وفکر کے تمام دروازے بند کر دئے ہیں۔ اب ہمارا کام صرف یہی رہ گیا کہ ہم متقدمین کی فہم پر کامل انحصار کریں اور ان کی تعبیری لغزشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ یہ خیال عام ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کا مفہوم اگر اسلاف کی فہم سے الگ ہوجائے تو اسے تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے گا اور راسخ العقیدہ مسلمان اسے قبول کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں گے۔ تو کیا عصر حاضر کے انسانوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں کہ وہ خدا کی اس کتاب کو جو مدت سے بند رکھی گئی ہے ایک بار پھر اسے سنجیدہ مطالعہ اور غور وفکر کا محور بنائیں۔ اس سوال کا اثبات میں جواب دینا حالات میں کسی انقلابی تبدیلی کے بغیر شاید ممکن نہیں۔

ہماری فکری تاریخ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن مجید پر راست غور وفکر کا زمانہ اب ہَوا ہوگیا حتیٰ کہ اب وہ اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ فقہاء کے دواوین کا قرآن کی روشنی میں نقد واحتساب کیا جائے۔ جب لوگ اس خیال کے قائل ہوں کہ قرآن مجید کی وہ آیتیں جو ہمارے فقہاء کے دواوین سے ٹکراتی ہوں وہ یا تو مؤول یا منسوخ ہیں؛ تو بھلا وہ اس بات کی کیوں ضرورت محسوس کریں گے کہ وہ اپنی ذاتی یا اجتماعی زندگی میں قرآن مجید کی طرف رجوع کریں۔ طرفہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہلِ علم حضرات بھی اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ چار ائمۂ فقہاء کا ظہور اور ان مسالک کی تدوین من جانب اللہ ہے؛ اس لئے ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ رہی یہ بات کہ ان فقہاء عظام کے توسط سے قرآن مجید کا مطالعہ ہمیں عہدِ عباسی میں پیش آنے والے مسائل سے نبرد آزما کرتا ہے اور یہ کہ عصر حاضر کہ مسائل پر رہنمائی کے لئے فقہا کے بجائے قرآن مجید کہیں زیادہ رہنمائی کا سزاوار ہے تو اصولاً اس بات کو قبول کر لینے کے باوجود ہم اس خوف سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں مبادا ہماری ناقص عقل ہمیں ٹھوکر کھانے پر مجبور کردے اور ہم فکری اعتبار سے خود کو ایک بحران میں گھرا پائیں۔ حالانکہ یہ نئی صورتحال کسی بحران کے بجائے ایک ایسی شدید فکری ہلچل پر منتج ہوسکتی ہے جو وحی کی تجلیوں کی بے نقابی سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا از سرِ نو کھولنا صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے لئے بھی ایک بڑا

وقوعہ ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیغمبر کے غیاب میں کتاب کا کھلنا اپنے اندر بڑا اندیشہ رکھتا ہے لیکن اسے کیا کیجئے کہ خدا کی اسکیم یہی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اب انسانی معاشرہ مجموعی طور پر اتنا بالغ ہو چکا ہے جہاں کسی پیغمبر کے غیاب میں بھی وہ وحی ربانی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کو منور کرسکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب خدا کوئی نبی نہ بھیجے گا۔ نبی کے غیاب میں خدا کی کتاب حجۃ من بعد الرسل کی حیثیت سے انسانوں کی رہنمائی کا کام انجام دیتی رہے گی۔

اس سے پہلے کہ قرآن مجید کو دنیائے انسانیت کے لئے فی الواقع کھول دیا جائے، اس سوال کو فیصل کر لینے کی ضرورت ہے کہ تشریح وتعبیر کا واقعی حق کسے حاصل ہے؟ طبقۂ علماء کو، اصحاب فقہاء کو، دینی علوم کی دانش گاہوں کو، فقہ کے حوالے سے قائم ہونے والی مجالس کو یا مسلم ریاستوں میں پائی جانے والی ہیئہ کبار علماء اور اوقاف کی وزارتوں کو۔ کیا قرآن مجید جیسا کہ وہ ہے بعینہ اسی حالت میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے یا مختلف مسالک کے حاملین کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اسے اپنے مسلک کی روشنی میں پڑھیں اور اسے اپنے موقف کی توثیق کے لئے استعمال کریں۔ مسالک کی باقاعدہ تعمیر کو کوئی گیارہ صدیاں بیت چکیں لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ان میں واقعی اہل الھوی کون ہیں اور اہل الحدیث کون؟ اہل عدل کون ہیں اور اہل سنت والجماعت ہونے کی سند کسے دی جاسکتی ہے؟ مذہب بنام مسلک جس کی حیثیت دین میں ایک نئے ایجاد کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کا سکّہ پچھلی گیارہ صدیوں سے چلتا رہا ہے۔ پہلی صدی کے آخر تک مذہب کا لفظ مدوّنہ مسلک کے معنوں میں مستعمل ہوتا دِکھائی نہیں دیتا البتہ تیسری صدی کی ابتداء میں اہل علم کے طریقۂ تحلیل وتجزیہ کے طور پر اس کا استعمال عام ہوجاتا ہے۔ لفظ مذہب (ذھب یذھب) سے ابتدائی عہد میں ایک ایسا طریقۂ فکر یا methodology مراد لیا جاتا تھا جسے مخصوص عالم نے اپنے لئے منتخب کرلیا ہو۔ تب ابوحنیفہ یا مالک کا مذہب کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسئلہ مذکور میں یہ ان حضرات کی مخصوص رائے ہے اور بس۔ تب کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ آنے والے دنوں میں بعض علماء کا طریقۂ تعبیر عام مسلمانوں کے لئے مذہبی شناخت کی حیثیت حاصل کرلے گا اور مسلم اہل فکر خود کو اس بات پر مجبور پائیں گے کہ وہ اپنے فہمِ قرآن کو اپنے ہی جیسے انسانوں کی فہم کے تابع کریں جس کے بغیر ان کی فہم کو اعتبار نہیں مل سکتا۔ ہماری فکری تاریخ کا یہ کتنا بڑا جبر ہے کہ آج قرآن مجید کی موجودگی کے باوجود ہم اس سے راست اکتساب کے تمام تر دروازے بند پاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ائمۂ فقہاء کے بغیر ہماری مذہبی زندگی کی مشین ایک لمحہ بھی حرکت نہیں کر سکتی۔ دنیا میں اس سے بڑا شاید ہی کوئی مغالطہ ہو جس نے صدیوں سے عاقل انسانوں کو مسمرائز کر رکھا ہو۔ معاملہ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہو یا مناسکِ حج کی تفصیلات کا۔ فقہ کی کتابوں نے آج تک کس مسئلہ کو فیصل کیا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ عملی طور پر شاید ہی کوئی سلیم العقل مسلمان ہو جو اپنے ائمہ کے ذریعہ متعین کردہ نماز کے تمام فرائض اور سنتوں کو بجا لاتا ہو۔ زکوٰۃ کے نصاب کے سلسلہ میں خود احناف کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رہے طہارت اور مأکولات کے مسائل، تو اس بارے میں جو چیز ایک کے یہاں ناپسندیدہ ہے وہی دوسرے کے یہاں پسندیدہ بن جاتی ہے۔ ہر مسئلہ پر فقہاء سے پوچھنے کے رویے نے ہمیں اپنے دل و دماغ کے استعمال سے روک دیا ہے۔ جب کوئی فقیہ کنویں کو پاک کرنے کے لئے چالیس ڈول پانی نکالنے کا مشورہ دیتا ہے یا جب کوئی حنفی فقیہ پیشاب لگے کپڑے کو پاک کرنے کے لئے جو خشک ہوگیا ہو، کسی ایک کونے کے دھو ڈالنے کا مشورہ دیتا ہے تو وہ کسی آسمانی ہدایت کی روشنی میں ایسا نہیں کرتا بلکہ وہ اسی عقل کو استعمال کرتا ہے جو اللہ نے ہر انسان کو دی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان تمام چھوٹے چھوٹے مسائل میں جہاں عقل ہماری رہنمائی کر سکتی ہو، ہم لازماً خود کو دوسرے کا دست نگر بنائیں۔ حرام و حلال کھول کھول کر قرآن مجید میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کے تمام مسائل خواہ وہ ہاتھ پر بیٹھی مکھی اڑانے کا معاملہ ہو یا اسے زہریلے چھڑکاؤ سے مارنے کا خیال ہو، یہ سب وہ مسائل ہیں جس پر ہر شخص کو اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہئے کہ ایسا نہیں کرنا عقل کے تئیں کفرانِ نعمت ہوگا۔

قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لئے کتابِ ہدایت ہے۔ یہ خیال کہ ماضی میں فقہاء و مفسرین نے اس سے ہدایت کا تمام تر عرق کشید کر لیا ہے اور یہ کہ اب ائمہ فقہاء و مفسرین کے بغیر قرآن کی کوئی فہم قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، ایک ایسا خیال ہے جس پر قرآن سے سند نہیں لائی جا سکتی۔ اس کے برعکس قرآن اس خیال کی نکیر کرتا ہے کہ انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو، خواہ وہ احبار و رہبان ہی کیوں نہ ہوں، ارباباً من دون اللہ کے منصب پر فائز کر دے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ بیان للناس ہے، ہدی للمتقین ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید انسانی دل و دماغ سے عبودیت کا فطری آبشار بہانا چاہتی ہے، اس کی توجہ عبودیت پر ہے رسومِ عبودیت پر نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حج کے ایام میں جب بعض صحابہ نے رسول اللہ سے یہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ان مناسک کی صحیح ترتیب کیا ہے؟ میں نے بعض مناسک پہلے ادا کر لئے اور

بعض بعد میں، تو آپ نے برملا کہا کہ اس میں کچھ حرج نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے کسی بھائی کو تکلیف نہ دے۔ نماز جیسی متواتر عبادت کی ادائیگی میں رفع یدین سے لے کر سلام کے پھیرے جانے تک مسلمانوں میں جو اختلاف چلا آتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ابتدائی عہد میں اس بات پر کسی کی توجہ کم ہی جاتی تھی کہ کس نے کہاں ہاتھ باندھ رکھا ہے، کوئی آمین زور سے کہتا ہے یا آہستہ سے، ساری توجہ اس امر پر مرکوز تھی کہ نماز بندے کا خدا سے رشتہ استوار کرتی ہے یا نہیں۔ اسی طرح روزے کے سلسلے میں اوقاتِ طلوع و غروب کے تعین کا کام انسانی اندازے پر چھوڑ دیا گیا۔ سکینڈ یا منٹ کے حوالے سے کسی باقاعدہ چارٹ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں العفو کی حد بندی کے بجائے اسے انسانی صوابدید اور اندرونی آمادگی پر چھوڑ دیا گیا۔ بتایا گیا کہ جو کچھ آپ کی ضرورت سے زیادہ ہے وہ دراصل آپ کا نہیں۔ ان تمام امور پر جہاں قرآن چاہتا ہے کہ عبودیت کاملہ کا آبشار انسان کے اندرون سے بہے، وہاں فقہ کی مداخلت اسے رسومِ عبودیت میں بدل دیتی ہے۔ یہ کچھ وہی صورتحال ہے جس پر اہل یہود کے حوالے سے قرآن میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب ان سے گائے کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا تو وہ اسے فی الفور کرگزرنے کے بجائے ان فقہی موشگافیوں میں لگ گئے کہ گائی کیسی ہو، اس سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہو یا نہیں، اور یہ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ ﴿لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن یناله التقویٰ منکم﴾

قرآن مجید کو از سرنو کھولنے سے پہلے لازم ہے کہ مسلم معاشرے میں پائی جانے والی چرچ جیسی صورتِ حال کا خاتمہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں پایا جانے والا یہ چرچ ایک نامحسوس عمل ہے جو اپنے زبردست اثرات کے باوجود تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی متشکل نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی بیخ کنی کسی لوتھر کے بس کی بات ہے اور نہ ہی کوئی فرد واحد اس چیلنج کو قبول کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا حقیقی مقابلہ صرف وحی ربانی کرسکتی ہے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہوسکتا ہے کہ ہم تمسک بالکتاب کی راست دعوت دیں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ کتاب کی فہم قدماء کی فہم کے تابع نہیں ہونی چاہئے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ہم قدماء کی فہم کو کتاب کی روشنی میں از سرنو تنقید و تجزیہ کا موضوع بنائیں۔ یہ بات میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ متقدمین نے قرآن مجید کو اپنے عہد میں برتنے کے لئے جو منہج تشکیل دیا تھا اس کے اندر صرف اس مخصوص عہد سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس زمانہ میں ان کی یہ تعبیر کہیں زیادہ قرین انصاف ہے۔ ضروری نہیں کہ آنے والے دنوں میں بھی یہی صورتِ حال برقرار رہی

ہو۔ مثال کے طور پر جب حضرت عمرؓ نے نص قرآنی کی موجودگی کے باوجود مخصوص حالت میں قطع ید کی حد کو ساقط کر دیا تو وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ان کا یہ قدم غایت قرآنی سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کے سلسلے میں صریح نص کی موجودگی کے باوجود اس عہد کے مسلمانوں کو خلفاء نے اور بعد کے دنوں میں فقہاء نے ایسی شادیوں سے احتراز کرنے کی ترغیب دی۔ عہد عمر میں ذمیوں کے لئے غیار پہننے کو لازم قرار دینا، انہیں گھوڑے کی سواری سے منع کرنا، یا نئے چرچ کی تعمیر سے روکنا ایسے اقدامات تھے جسے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نافذ کرنا ضروری سمجھا[1]۔ ضروری نہیں کہ آنے والوں دنوں میں یہ صورتِ حال برقرار رہے۔ اسی طرح ﴿ فانکحوا ماطاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث وربع ﴾ جیسی آیت سے اس کے سیاق کے علی الرغم فقہاء نے سماجی انصاف کے قیام کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ شہدا کی بیواؤں کو سہارا دینے کے لئے مسلم معاشرے کے اندر گنجائش پیدا کی جائے۔ ضروری نہیں کہ ایسا کرنا آج بھی سماجی انصاف کی ضمانت دے سکے۔ ﴿ ولو شاء اللہ لجعلکم امة واحدة و لکن لیبلوکم فی ما آتاکم ﴾ جیسی آیت کے تناظر میں اہل کتاب یا موحدین کے دوسرے گروہوں کی نجات کے سلسلہ میں جو واضح اشارے ملتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصٰری والصٰبئین من آمن باللہ والیوم الآخر و عمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ﴾ ان جیسی آیات کو فقہاء نے آیت سیف کے ذریعہ منسوخ کر رکھا ہے۔

---

[1] ہمارے خیال میں ان اقدامات کا خلیفۂ ثانی سے منسوب کرنا تاریخی طور پر غلط ہے۔ حضرت عمرؓ کے حوالے سے اس غلط فہمی کے عام ہونے کی وجہ کتاب الام میں امام شافعیؒ کا اس وثیقہ کو نقل کرنا ہے جس کے بارے میں مورخین اب تک یہ طئے نہیں کر پائے ہیں کہ یہاں عمر سے مراد حضرت عمر بن خطابؓ ہیں، عمر بن عبدالعزیز ہیں یا کوئی اور عمر۔ اس وثیقہ کے مطابق حضرت عمر نے نئے چرچ کی تعمیر یا پرانے چرچ کی مرمت پر حکم امتناعی جاری کر رکھا تھا۔ اہلِ کلیسا کو گھڑ سواری کرنے اور اپنے بچوں کو قرآن پڑھانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کی کم تر سماجی حیثیت کے اظہار کے لئے ان پر غیار پہننا لازم کر دیا گیا تھا۔ خلیفۂ عمر کی طرف ان اقدام کی منسوبی اس لئے بھی قرینِ عقل نہیں کہ جو عمر فتحِ فلسطین کے موقع پر معاہدۂ امن میں اہل کلیسا کا تذکرہ انتہائی احترام سے کرتا ہو وہ جو کھلے عام ان کی تذلیل کے احکام کیسے جاری کر سکتا ہے؟ بعض اہلِ علم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہم جس دستاویز کو وثیقہ عمر کے نام سے جانتے ہیں وہ دراصل شامی عیسائیوں کی جانب سے پیش کیا جانے والا مجوزہ معاہدۂ امن ہے جو انہوں نے حضرت عمر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ حضرت عمر نے اس امن منصوبے کا کیا جواب دیا، اسے آپ کی تائید حاصل ہو سکی یا نہیں۔ البتہ کتاب الام میں اس وثیقے کی شمولیت کے سبب اسے مجوزہ مسودہ کے بجائے بڑی حد تک راسخ العقیدہ فکر کے ترجمان کے طور پر دیکھا جانے لگا۔

موجودہ سمٹتی دنیا میں جہاں مسلمانوں کے لئے کسی دارالاسلام میں سمٹ کر علیحدہ رہنا ممکن نہیں رہا، جہاں مختلف امتوں کے مابین کلمۃ سواء کی بنیاد پر مشترکہ پروگرام کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہونے لگی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس نئی صورتحال میں قدیم مفسرین کی اس فہم پر اصرار کریں کہ ﴿غیر المغضوب علیھم ولا الضالین﴾ سے بالترتیب یہود ونصاریٰ مراد ہیں۔ نئی بدلی ہوئی صورتِ حال میں قرآن مجید کے صفحات پلٹنے اور اس سے اکتساب ہدایت کا واضح مطلب ہوگا کہ ہم ذہنی طور پر اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ ہمارا فہم قرآن ہمیں قدما سے الگ راستہ کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ اس نفسیاتی جھٹکے کے لئے ہم جب تک تیار نہیں ہوں گے قرآن کھولنے کے ہمارے تمام دعوے اس پر مزید قفل چڑھانے کے مترادف ہوں گے۔



تیرہ صدیوں پر مشتمل عظیم تعبیری ادب کا محاکمہ اگر وحی ربانی کی روشنی میں کیا جاسکے تو یہ ہماری تاریخ کاایک عظیم وقوعہ ہوگا۔ ہم ایسا محسوس کریں گے گویا ایک بار پھر عہد رسول کا اسلام ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہوگیا ہو۔ دنیا میں ساری بڑی تبدیلیاں خیالات کے سہارے آتی ہیں۔ خیالات میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ جس قوم کے پاس کوئی خیال نہ ہو اور جو صدیوں سے قدماء کی کتابوں پر حاشیہ در حاشیہ لکھنے کو علم کا معراج سمجھتی ہو اس کے لئے کسی نئ صبح کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔ جہاں متوارث اسلام انسانوں کو فرقوں میں بانٹتا، شیوخ اور فقہاء کے خیموں میں منقسم کرتا، جماعتی اور گروہی ذہنیت کا اسیر بناتا وہیں حقیقی اسلام قرآن مجید کے بالمقابل تمام انسانی قرآنوں کے غیاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی صورتحال کے قیام کی دعوت دیتا ہے جہاں خدا کی کتاب کے علاوہ تمام انسانی تالیفات نا قابل اعتبار قرار پا گئی ہوں۔ تمسک بالکتاب کا واقعی حق اسی ماحول میں ادا ہوسکتا ہے۔

۱۰

مسجد ضرار کے سائے میں

مسلمان جو گزشتہ کئی صدیوں سے مسلسل مدافعت کی جنگ لڑ رہے ہیں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کی جدوجہد اتنی بے شمار قربانیوں کے باوجود آخر ثمر بار کیوں نہیں ہوتی ؟ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ تین سو برسوں میں نوآبادیاتی اور استبدادی نظام کے خلاف مسلمانوں نے غیر معمولی قربانیاں دی ہیں اور آج بھی دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ نظامِ جبر کے خلاف جو لوگ برسرِ پیکار ہیں ان کا تعلق اسی قومِ مسلم سے ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ صورتِ حال میں کوئی خوشگوار تبدیلی تو کیا آتی خود مسلمانوں کی تلواریں آپس میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ جہاد افغانستان کے خاتمے پر مجاہدین کے مختلف گروہ جس آپسی خانہ جنگی کا شکار ہو گئے اس نے اس خیال کو مزید مستحکم کر دیا کہ اہل قبلہ کا باہمی اتحاد خیال عبث ہے۔

جو لوگ سوویت یونین کو شکست دے سکتے تھے ان کے لئے اس گرہ کی عقدہ کشائی ممکن نہ ہو سکی کہ آخر کیا چیز ہے جو ان کے اندرون سے ان پر ضرب لگاتی ہے اور جس کے سبب ان کا اتحاد اپنی تمام تر امکانی کوششوں کے باوجود وجود میں آنے سے رہ جاتا ہے۔ اہل فکر مسلمانوں کو یہ سوال بھی پریشان کرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اہل ایمان کے ایک گروہ کو جب اللہ تعالیٰ زمین میں اقتدار سے نوازتا ہے تو وہ اہل قبلہ کے دوسرے گروہوں پر خدا کی زمین تنگ کر دیتے ہیں؟ طالبان کے افغانستان میں اہل قبلہ کے دوسرے گروہوں کا ایمان اور ان کی مذہبی فکر جس طرح قابل استرداد قرار پائی یا موجودہ سعودی عرب میں سلفی اسلام

کے علاوہ دین کی دوسری تعبیروں کو جس طرح لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا' ان باتوں نے عام مسلمانوں پر دین اور اس کے احیاء کے سلسلے میں یک گونہ مایوسی طاری کردی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خدا مذہبی مسلمانوں کو آج اگر دنیا کے کسی خطے میں اقتدارِ کُل سے نواز دے تو یہ سوال کلیدی اہمیت اختیار کرلے گا کہ دین کی کون سی تعبیر کے مطابق نئی ریاست کا انتظام و انصرام چلایا جائے۔

مسلم اہل فکر اس بات کا احساس تو ضرور دلاتے رہے ہیں کہ کہیں کوئی بڑی گڑ بڑی ہمارے فکری سرمایے میں در آئی ہے جس کی وجہ سے آج ہم من حیث الامۃ' از سرنو اٹھ کھڑے ہونے کی پوزیشن میں خود کو نہیں پاتے۔ البتہ اس بڑی گڑ بڑی یا فکری انحراف کے سدباب کی یا تو ہم اپنے اندر ہمت نہیں پاتے یا یہ سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی انقلابی قدم اٹھانا امت کے رہے سہے تنظیمی ڈھانچے کو بھی تباہ و برباد کردے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصل مرض کے علاج سے اعراض پر ہم خود کو مسلسل مجبور پاتے ہیں۔ بھلا جب کسی مرض کا علاج ہی نہ کیا جائے اور اس سلسلے میں کوئی معمولی قدم اٹھانے سے بھی ہمیں خوف آئے تو مستقبل میں کسی خوشگوار تبدیلی کی بات کیسے سوچی جاسکتی ہے؟

قوموں کی کامیابی کے لئے باہمی اتحاد محض کوئی سرّ الہامی نہیں بلکہ دل و دماغ کو لگتی بات ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ ہمارے اہل فکر اور عامی مسلمان اس نکتہ سے واقف نہیں۔ قرآن مجید میں جہاں حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے اور انتشار سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے وہیں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ باہمی اختلاف اہل ایمان کے لئے سم قاتل ثابت ہوگا، ان کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ مسلمان جو خود کو حامل توحید کہتے ہیں وہ اس نکتہ سے بھی ناآشنا نہیں کہ توحید نظری طور پر انسانوں کو جوڑتا ہے جب کہ اس کے برعکس شرک انسانوں کو خانوں میں بانٹتا ہے۔ ایک ربانی معاشرے میں جو تقویٰ کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے، شعوب و قبائل کی شناختیں، تفرقے اور گروہ بندیوں کی نفسیات پر صبغۃ اللہ کا غلبہ اس بات سے عبارت ہے کہ مختلف شعوب و قبائل پر مشتمل یہ امت اب بنیان مرصوص میں تبدیل ہوچکی ہے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کے ربانی معاشرے میں اگر اس کیفیت کا فقدان ہو اور انہیں بار بار یہ احساس ہوتا ہو کہ کوئی چیز ان کے اندرون سے ان کے اتحاد کو مسلسل تارتار کئے دے رہی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ جس چیز کو حبل اللہ سمجھ بیٹھے ہیں وہ دراصل کچھ اور ہے۔

ہم مسلمان اگر ایک سخت ایمان دارانہ محاسبہ پر آمادہ ہوسکیں تو ہمیں شاید یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے کہ اہل قبلہ کے مختلف گروہوں نے جس چیز کو وثوق و اعتماد سے تھام رکھا ہے وہ دراصل حبل اللہ

نہیں بلکہ حبل الرجال یا حبل الاحبار ہے۔ وہ دین جو یہودی نصرانی جیسی شناختوں کو لائق استراد ٹھہراتا ہو اور جسے یہ بھی گوارا نہ ہو کہ متبعین محمدؐ خود کو محمدی کی حیثیت سے پیش کریں بھلا اس دین میں اس بات کے لئے کیسے گنجائش نکل سکتی ہے کہ متبعین محمدؐ خود کو حنفی شافعی، شیعہ سنی یا تحریکی اور جماعتی کہلانا گوارا کرلیں۔ ربانی معاشرے میں ان غیر ربانی شناختوں کا ظہور گویا اس بات سے عبارت ہے کہ قرآن مجید نے جس حبل اللہ کو سختی سے تھامے رہنے کی تلقین کی تھی وہ اب ہمارے ہاتھوں سے بدقسمتی سے پھسل گئی ہے۔

آج ہم جن چیزوں کو مذہب کا لازمہ سمجھ بیٹھے ہیں اور جن شناختوں کے بغیر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فریضۂ دین کا ادا کرنا شاید ممکن نہ ہو ذرا غور کیجئے اس کی تاریخی اور نظری حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ فقہی اور مسلکی شناختیں واقعی اس لائق ہیں کہ ہم نسلاً بعد نسل اس غیر ضروری بوجھ کو اپنے کمزور کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ ابتدائی عہد میں جب مسلمانوں میں فرقوں اور مسلکوں کا ظہور نہ ہوا تھا پوری امت وحی ربانی کے نظری ماحول میں سانس لیتی تھی۔ بسا اوقات مختلف امور میں اہل فکر مسلمانوں کے مابین اختلاف بھی ہوتا لیکن اس اختلاف کی بنیاد پر کوئی مستقل مدرسۂ فکر وجود میں نہیں آتا بلکہ امرہم شوریٰ بینہم کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اہل ایمان کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے۔ تیسری صدی کے وسط تک فقہی یا نظری اختلاف کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے کا کوئی رواج نہ تھا۔ شیعہ سنی کی روایت کی کتابیں بھی مشترکہ تھیں۔ یہی وجہ کہ صحاح ستہ میں آج بھی شیعہ مسلک کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

فقہی شناخت کے مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ ابوحنیفہ جن کا سال وفات ۱۵۰ہجری ہے اور ادریس شافعی جن کا انتقال ۲۰۴ہجری میں ہوا اور جن کی بنیادوں پر ہم مسلکی شناخت کو روا رکھتے ہیں ان حضرات کے ظہور سے پہلے اہل ایمان کی جونسل اس سرزمین پر موجود رہی آخر ان کی مذہبی زندگی کی مشین کیسے متحرک رہی۔ اگر رسول اللہ کے وصال کے سو سال بعد بھی مسلمان ائمہ فقہاء کے بغیر مذہبی زندگی کی تنظیم وترتیب کرسکتے تھے تو پھر اکیسویں صدی کی ابتداء میں ہم بالکل اسی طرز کی ایمانی زندگی کیوں نہیں جی سکتے؟ بالخصوص جب ہمارا یہ ایمان ہو کہ اسلام ایک آسمانی دین کی حیثیت سے عہد رسول میں اپنے اتمام کو پہونچا اور یہ کہ عہد رسول کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ اہل فکر مسلمانوں کی تاریخ ہے اور یہ کہ نبی کے علاوہ کسی اور شخص کو یہ مقام حاصل نہیں کہ اس کی ذات ہمارے لئے ناگزیر حوالہ بن جائے۔

افسوس کہ فقہی بنیادوں پر جب ایک بار گروہ بندی کو اعتبار مل گیا تو یہ سلسلہ کسی طرح نہ روکا جاسکا۔ بظاہر چار ائمہ فقہاء کو canonize کئے دینے سے پانچویں یا چھٹے امام کے ظہور کا راستہ تو رک گیا

لیکن عملاً مسلکی گروہ بندیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وہ امت جسے حبل اللّٰہ تھامنے کی سخت تاکید کی گئی تھی وہ آج بھانت بھانت کے شیوخ و مصلحین کا دامن تھامے افتراق و انتشار کی بدترین تصویر پیش کررہی ہے۔اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ فرقہ وارانہ شناخت کے قیام اور ان کی تبلیغ کے لئے باقاعدہ مسجدیں اور مدارس وجود میں آ گئے ہیں جو شب و روز اپنے اپنے قلعوں سے اپنے مسلک اور اپنے شیوخ کی سربلندی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے ان تمام گروہوں کو اپنے بارے میں اس بات کی غلط فہمی بھی ہے کہ وہی فرقۂ ناجیہ ہیں اور یہ کہ ان کے علاوہ اہل ایمان کے دوسرے تمام گروہوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اگر دنیا بھر میں مساجد کی کثرت اور قال اللہ و قال الرسول کی درسگاہوں کی موجودگی کے باوجود مسلمانوں کا زوال روکے نہیں رکتا اور ان کا انتشار مسلسل بڑھتا جاتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان مساجد و مدارس سے ربانی بننے کی دعوت دی ہی نہیں جارہی ہے۔ حبل اللہ کے بجائے ہمارے علماء و قائدین کھلے عام حبل الرجال تھام لینے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ تمام ہی فرقوں اور جماعتوں کی دعوت کا لب لباب یہ ہے کہ ہمارے گروہ میں شامل ہوجاؤ کہ یہی نجات کا راستہ ہے اور یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ بقول ان فرقہ پروروں کے امت کی صفوں میں اتحاد پیدا ہوسکتا ہے۔ مساجد ہوں یا مدارس عملی طور پر اس پر کسی نہ کسی گروہ یا جماعت کا قبضہ ہے۔ بھلا جو مسجدیں مسلمانوں میں فرقہ بندی کو ہوا دینے کے لئے بنائی گئیں ہوں اگر وہ مسجد ضرار جیسے نتائج پیدا نہ کریں تو اس بات پر ہمیں تعجب کرنا چاہئے۔

افسوس تو اس بات پر ہے کہ مسلم معاشرے میں مسجد ضرار کی اس عمومی فضا کا احساس بھی ہمیں کم ہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کونوا ربانیین کی دعوت دینے والی امت اس راہ پر کیسے چل نکلی کہ اس کے درمیان الگ الگ شیعہ وسنی مسجدوں کا قیام عمل میں آ گیا اور پھر یہ سلسلہ بریلوی، دیوبندی، جماعتی اور سلفی مسجدوں کے قیام پر منتج ہوا۔ ایک خدا کی بندگی کی طرف بلانے والے لوگ فرقہ پرستی کے شرک میں کچھ اس طرح کیسے مبتلا ہوگئے کہ انہیں اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ اب صبغۃ اللہ کے بجائے جماعتی، سلفی، حنفی یا شافعی بننے کی دعوت دینے لگے ہیں اور یہ کہ ان کے اس عمل پر اب قرآن مجید کی یہ آیت بڑی حد تک صادق آنے لگی ہے ﴿والذین اتخذوا مسجدا ضرارا و كفرا و تفريقا بين المؤمنين ﴾۔ جو مسجدیں مسلمانوں کو ضرر پہونچائیں، جہاں کے خطبے اتحاد اسلامی کو پارہ پارہ کردیں، بھلا ایسی تفریق پرور مسجدوں سے کسی خیر کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟ فرقوں کے زیر اثر آج جو مختلف مسجدیں وجود میں آرہی ہیں ان کے داعی بظاہر تو یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ ہماری نیت تو بھلائی کی ہے ﴿ان اردنا الا الحسنى ﴾ لیکن اللہ تعالی

کہتا ہے ﴿واللّٰہ یشھد انھم لکاذبون﴾ کہ خدا گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔

صورتِ حال اب اتنی خراب ہوگئی کہ دینی اداروں کے اشتہارات اب کھلے عام یہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ درخواست دہندگان کے لئے لازم ہے کہ اس کا تعلق ان کے مسلک سے ہو۔ گزشتہ ماہ پاکستان سے شائع ہونے والے ایک مؤقر تحریکی رسالہ میں جدید تکنیکی تعلیم کے لئے نوجوانوں سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں جہاں اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ سہولت تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کے بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی امت ہے جس کی پہلی نسل، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے، اس وسعت قلبی کی حامل تھی کہ وہ عالمی نظام انصاف کے قیام میں اہل کتاب کے صالحین کو بھی شرکت کی دعوت دیتی اور تمام انسانوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ اسلام اور مسلمانوں کے دروازے ان پر کھلے ہیں۔ مسجد ضرار کی فرقہ وارانہ فضا نے اب اہل فکر مسلمانوں اور دعوت دین کے حاملین کو بھی اس تنگ نظری میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ اپنے فرقے سے باہر اہل قبلہ کے دوسرے گروہوں کے لئے کسی فلاحی منصوبے کی بات سوچنے سے عاجز ہیں۔

جب تفرقہ بندی کی جڑیں اتنی مضبوط اور گہری ہوں تو یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ مسلمان کسی مصنوعی طریقے سے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرسکتے ہیں۔ جب تک تفرقے کی ان بنیادوں پر تیشہ نہیں چلایا جاتا امت کا بنیان مرصوص میں تبدیل ہونا امر محال ہے۔ اول تو ان چار فقہاء کے لازمۂ دین ہونے کے لئے قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ ثانیاً یہ خیال بھی لغو ہے کہ ائمہ فقہاء، یا وہ متکلمین جن کے فہم دین پر مختلف جماعتیں وجود میں آ گئی ہیں، کے بغیر ہماری مذہبی زندگی کی مشین متحرک نہیں رہ سکتی۔ جب دوسری صدی کی ابتدا تک مسلمان ائمہ فقہاء کے بغیر کہیں بہتر دینی زندگی جی سکتے تھے تو آج قرآن مجید اور اسوۂ رسول کی موجودگی میں یہی کام آخر کیوں نہیں انجام دیا جاسکتا؟ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ان انسانی حوالوں کو دین کا لازمہ قرار دیدیا جائے جن پر کتاب اللہ سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی اور جن کے ظہور پر یقیناً رسول اللہ نے ہمیں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس منتشر پراگندہ حال امت کو اگر بنیان مرصوص میں تبدیل کرنا مقصود ہے اور اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ امت کو تفرقہ بندی اور جماعت سازی جیسے شرک سے نجات ملے اور تفریق بین المؤمنین کے اس ضراری سلسلے پر یکسر روک لگادی جائے تو ہمیں خود کو ایک بڑے نظری آپریشن کے لئے آمادہ کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تمام تر کوششیں تو فرقوں کے استحکام کے لئے کی جارہی ہوں اور اس کے نتیجے میں ایک متحد امت یا ربانی معاشرے کا ظہور عمل میں آجائے۔



ہم مسلمان اگر ایک سخت ایمان دارانہ محاسبہ پر آمادہ ہوسکیں تو ہمیں شاید یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے کہ اہل قبلہ کے مختلف گروہوں نے جس چیز کو وثوق و اعتماد سے تھام رکھا ہے وہ دراصل حبل اللہ نہیں بلکہ حبل الرجال یا حبل الاحبار ہے۔ وہ دین جو یہودی نصرانی جیسی شناختوں کو لائق استراد ٹھہراتا ہو اور جسے یہ بھی گوارا نہ ہو کہ متبعین محمدؐ خود کو محمدی کی حیثیت سے پیش کریں بھلا اس دین میں اس بات کے لئے کیسے گنجائش نکل سکتی ہے کہ متبعین محمدؐ خود کو حنفی شافعی، شیعہ سنی یا تحریکی اور جماعتی کہلانا گوارا کرلیں۔ ربانی معاشرے میں ان غیر ربانی شناختوں کا ظہور گویا اس بات سے عبارت ہے کہ قرآن مجید نے جس حبل اللہ کو سختی سے تھامے رہنے کی تلقین کی تھی وہ اب ہمارے ہاتھوں سے بدقسمتی سے پھسل گئی ہے۔

۱۱

مسئلہ فلسطین پر ایک نئی پہل کی ضرورت

مسلمان اپنے تمام تر فکری زوال اور ملّی انحطاط کے باوجود اس نکتے سے ناآگاہ نہیں کہ دنیا میں قیام امن کی ذمہ داری دوسری اقوام کے مقابلے میں ان پر کہیں زیادہ عائد ہوتی ہے۔ آخری رسولؐ کی امّت کی حیثیت سے تاریخ کے آخری لمحے تک متبعیّن محمدؐ کو رحمۃ للعالمینی کا فریضہ انجام دینا ہے گویا دنیا میں اب خیر کے تمام معرکوں کی قیادت ان ہی کو کرنی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو جب خدا کے آخری پیغام کی تحمیل کا شرف انھیں حاصل ہے۔

مسلمان اگر اس نظری منصب پر فائز ہوتے اور رحمۃ للعالمینی کے فلاحی پروجیکٹ میں ان کا اقدامی (pro-active) رویّہ برقرار رہتا تو آج دنیا کا منظرنامہ یکسر مختلف ہوتا۔ لیکن افسوس کہ اسلام کی ابتدائی چند صدیوں کے بعد سے ہی مسلمانوں میں اس عظیم نبوی منصب کا شعور دھندلا ہوتا گیا، یہاں تک کہ اموی اور عبّاسی سلسلۂ حکمرانی آگے چل کر بڑی حد تک امپائر بلڈنگ کے کام میں لگ گئیں۔ ابتدا میں تو ایسا محسوس ہوا کہ اسلام کی نظری آمیزش اگر خالص نوآبادیاتی پروجیکٹ میں بھی شامل ہوجائے تو اس سے اقوام عالم کی مسیحائی کا بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ اسی نظری آمیزش کا اثر تھا جس نے اسپین کی اموی حکمرانی اور برصغیر کی مغل شہنشاہی پر اخلاقی اور روحانی دبدبہ کو قائم رکھنے میں مدد دی۔ البتہ اسلام کے یہ مختلف قالب جو عسکری طور پر مختلف زمانے اور مختلف خطّوں میں اپنی اثر انگیزی کا ثبوت دیتے رہے، رفتہ رفتہ

اپنے اصل انبیائی قالب سے اتنے دور ہوگئے تھے کہ مسلسل تین سو سالوں کی خون آشام جدو جہد کے باوجود عثمانی ترکوں کی زبردست مزاحمت بھی اس ڈھانچے کو گرنے سے نہ بچاسکی۔ ۱۹۲۴ء میں سقوط خلافت کے بعد جو کربیہ منظر نامہ ہمارے سامنے آیا وہ اتنا بھیانک تھا کہ اس نے بڑے بڑے حقیقت پسندوں کے حواس معطل کردیے۔ وہ امّت جو کبھی اقوامِ عالم کی رہنمائی پر مامور تھی، اس کا ایک جسد واحد کے طور پر برقرار رہنا مشکل ہوگیا۔

مسلمانوں میں فکر ونظر کا یہ زوال کوئی نیا عمل نہ تھا البتہ عسکری برتری اور شخصی حکومت کے مختلف سلسلوں نے اس صورت حال پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ عامة المسلمین اس خوش فہمی میں جیتے تھے کہ وہ اب بھی محمد رسول اللہ کے انقلاب انگیز پیغام کے امین ہیں اور یہ کہ آج بھی ان کے دم سے دنیا کی مسیحائی وابستہ ہے۔ گوکہ اہلِ نظر ہماری تاریخ کے مختلف دور میں زوالِ فکر ونظر کا شکوہ کرتے رہے ہیں اور ہزیمت کے مختلف موقعوں پر ہمارے یہاں یہ بحث بھی جاری رہی ہے کہ ہم تاریخ کے طویل سفر میں اپنے اصل مشن سے دور جا پڑے ہیں، لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد امّت کو جس چشم کشا اور لرزہ خیز صورت حال کا سامنا تھا اس نے بڑے بڑے اہلِ فکر کے حواس معطل کردیے۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست نے صرف خلافت کے علامتی ادارے کو ہی ختم نہیں کیا بلکہ (Sykes-Picot Treaty) کے اسرار وعواقب نے مسلمانوں کے مقابلے میں یہود ونصاریٰ کے اتحاد کی گویا پہلی اینٹ رکھ دی۔ آگے چل کر ارضِ فلسطین میں ریاست اسرائیل کا قیام اور پھر آرمیگاڈان کی راہ ہموار کرنے کے لیے خلیجی جنگوں کا سلسلہ اسی نامبارک عمل کا تسلسل ہے جس کے واقعی تحلیل وتجزیے کی کوئی وقیع کوشش سچ پوچھیے تو اب تک عالمِ اسلام میں نہیں ہوسکی ہے۔ مسلم اہلِ فکر نہ صرف یہ کہ صورت حال کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ نہیں بلکہ من حیث الامّت اب تک اس سلسلے میں ہمارا رویّہ دفاعی نوعیت کا رہا ہے۔ ہم گزشتہ پچاس ساٹھ سالوں سے دوسروں کے اقدامی عمل پر اپنی مزاحمت درج کراتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم مسلسل پسپائی کے شکار خود کو ایک ایسی بند گلی میں پاتے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سنگین صورت حال کا ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ گہرائی سے تجزیہ کیا جائے، جب ہی ہم مسئلہ پر کسی اقدامی عمل کی پوزیشن میں ہوسکتے ہیں۔

مذہبی یہودی اور شدّت پسند عیسائی جو حضرت مسیح کی آمد ثانی کی راہ ہموار کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ میں تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کی منصوبہ بندی کررہے ہیں، دراصل تاریخ کی اساطیری تفہیم کا

شکار ہیں۔ اہلِ یہود کو یہ اُمید ہے کہ مسیحا کی آمد ان کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا سبب بنے گی، داؤد وسلیمان کی حکومتوں کا سابقہ جاہ وحشم لوٹ آئے گا اور اقوامِ عالم پر اہلِ یہود کی فضیلت دوبارہ قائم ہوجائے گی۔ دوسری طرف عیسائی روایت پرست یہ اُمید لگائے بیٹھے ہیں کہ فلسطین میں یہودی معبد کی تیسری تعمیر سے حضرت مسیح کی آمد ثانی یقینی ہوجائے گی جس کے بعد تاریخ کی کمان کُلی طور پر ان کے متبعین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ گویا روایت پرست عیسائیوں کا مفاد اس امر سے وابستہ ہے کہ فلسطین میں بہرطور صہیونی منصوبہ آگے بڑھے۔ روایت پرست عیسائی جو فی زمانہ امریکی سیاسی نظام میں خاصے مؤثر ہیں ارض فلسطین میں ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہیں۔ اہلِ یہود اور عیسائیوں کے اساطیری اور خلافِ عقل طرزِ فکر نے نہ صرف یہ کہ عالمِ اسلام کو ایک سنگین صورت حال سے دوچار کر دیا ہے بلکہ ان غیر عقلی رویّوں سے عالمی امن کو بھی سخت خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

معاصر دنیا میں یہودی خودکو ایک عجیب صورت حال سے دوچار پاتے ہیں۔ پچھلے دو ہزار سالوں میں یہ پہلا موقع ہے جب ارضِ فلسطین میں ایک اسرائیلی ریاست نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ دنیا کی واحد سُپر پاور اس کی اطاعت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ عملی طور پر یروشلم اسرائیلی ریاست کا حصّہ ہے لیکن اس کے باوجود اہلِ یہود کے لیے اب تک یہ ممکن نہیں ہوسکا کہ وہ تیسرے معبد کی شکل میں اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کر پاتے۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا قیام یہودیوں کے لیے ایک معجزہ سمجھا جاتا تھا اور جب ۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں غیر متوقع طور پر یروشلم کا مقدس شہر بھی اسرائیل کی جھولی میں آ گرا تو پوری یہودی دنیا ایک طرب انگیز کیفیت سے دوچار ہوگئی۔ ایسا محسوس ہوا گویا خدا نے دوبارہ اہلِ یہود پر اپنا دست شفقت رکھ دیا ہے۔ لیکن اس طرب انگیز ایام میں بھی اگر اہلِ یہود بیت المقدس کے علاقے میں تیسرے معبد کی بنیاد نہ رکھ سکے تو اس کی وجہ بڑی حد تک فقہی اور مذہبی پیچیدگیاں تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی فقہ کے مطابق اس وقت تمام یہودی عالمِ ناپاکی میں ہیں اور ایسی حالت میں اگر کوئی شخص تیسرے معبد کی حدود میں قدم رکھے گا تو اس کی سزا موت ہے۔ طہارت کے لیے لازم ہے کہ ایک ایسی سرخ گائے کی راکھ سے تیمم کیا جائے جس کی قربانی ایک کاہن کی نگرانی میں عمل میں آئی ہو۔ معبد کے لئے مقامِ محراب (alter) کا تعین بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مقام کا تعیّن عام ربائیوں کے بس کی بات نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب دوسری دفعہ معبد کی تعمیر نو ہوئی تھی تو اس وقت ایسے مشاہدین موجود تھے جو اس مقام کی نشان دہی کر سکیں لیکن آج اس مقامِ مقدس کی نشان دہی کے لیے دنیا میں کوئی شخص موجود نہیں

۔ اہلِ یہود کا ایمان ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر سے پہلے ان کے ایک برگزیدہ پیغمبر علیجاہ کا ظہور ہوگا جو وثوق کے ساتھ اس مقام کی نشاندہی کر سکے گا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر علیجاہ کی نگرانی میں ہوگی ۔ سرخ گائے کی قربانی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اہل یہود میں ایک ربائی اعظم موجود ہو جسے اکہتّر ربائیوں کی مجلس (Sanhedrin) نے منتخب کیا ہو۔ اس مجلس کا رکن ہونے کے لیے لازم ہے کہ متعلقہ ربائی کی سندیافتگی کا سلسلہ سینہ بہ سینہ حضرت موسیٰ تک جا پہنچتا ہو ۔ مصیبت یہ ہے کہ اہلِ یہود کے اپنے تاریخی بیان کے مطابق عیسائی حکمراں قسطنطین (Constantine) کے استبدادی ہتھکنڈوں کے زیرِ اثر ۳۵۸ء میں یہودی ربائی روایت کا یہ تسلسل ٹوٹ گیا ۔ پھر یہودی دنیا ابھی تک اس مسئلہ کا بھی کوئی حل دریافت نہیں کر پائی ہے کہ تیسرے معبد کی تعمیر سے قبل اہلِ یہود کے حتمی نجات کے لیے جن دوسرے دس گُم شدہ قبائل کی واپسی لازمی ہے وہ اس وقت کہاں ہیں اور کب آئیں گے ۔ بعض یہودی روایتوں کے مطابق مسیحا کی آمد سے قبل پیغمبر علیجاہ کا ظہور ہوگا۔ اور چوں کہ علیجاہ سینہ بہ سینہ ربائی سلسلے میں حضرت موسیٰ سے جاملتے ہیں ، ان کے بارے میں یہ خیال بھی عام ہے کہ وہ یہودیوں کی مجلس اعلیٰ (Sanhedrin) کی تنظیمِ نو کریں گے۔

یہ ہے وہ منظر نامہ جس نے اہلِ یہود کو تمام تر قوت وسطوت کے باوجود تیسرے معبد کی تعمیر سے روکے رکھا ہے ۔ رہے سیکولر یہودی تو وہ انتظار کی زحمت میں اپنا وقت گنوانا نہیں چاہتے ۔ سچ پوچھیے تو ریاست اسرائیل کا قیام سیکولر اور (Zionist) یہودیوں کی کوششوں سے ہی ممکن ہوسکا ہے ۔ مذہبی یہودیوں کے بعض حلقے آج بھی ریاست اسرائیل کو خدائی اسکیم کے خلاف ایک مصنوعی عمل سمجھتے ہیں۔ وہ اس خیال کا اظہار کرتے نہیں تھکتے کہ جب تک اہلِ یہود کی وافر تعداد اسرائیل میں جمع نہ ہوجائے تیسرے معبد کی تعمیر کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ بعض حلقوں سے ایسی آوازیں بھی آتی رہتی ہیں کہ ارضِ کنعان میں مستقبل کی جنگ میں چوں کہ اہلِ یہود کی غالب آبادی کا صفایا ہونا ہے اس لیے اہلِ یہود کے ارتکاز کی یہ مصنوعی کوشش ایک شیطانی اسکیم کا حصّہ ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان مختلف الآراء آوازوں کے باوجود آج اسرائیلی ریاست ایک حقیقت ہے ۔ سیکولر یہودی تمام حلاقائی یا فقہی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی بالادستی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں۔ البتہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود معبد کی تعمیر کا کام اگر اب تک سرد مہری کا شکار رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے کا مرحلہ فقہ یہود میں ایک بڑی اور بنیادی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ۔ سیکولر یہودیوں کو اس خیال سے بھی وحشت ہوتی ہے کہ اگر معبد اپنے پُرانے

قالب میں تمام تر جزئیات کے ساتھ وجود میں آ بھی گیا تو جانوروں کی اتنے بڑے پیمانے پر قربانیاں، خون چھڑکے جانے کی رسم اور گوشت کے جلتے رہنے کی ناگوار مہک کیا موجودہ دنیا کے لیے قابلِ قبول ہو سکے گی؟ دیکھا جائے تو یہودی جاہ وحشم کا یہ منصوبہ جس میں معبد کی تیسری تعمیر کو مرکزی مقام حاصل ہے، ایک پیچیدہ فقہی حصار میں پھنس کر رہ گیا۔

دوسری طرف ایک مفروضہ خدائی منصوبے کو مصنوعی طریقے سے مہمیز دینے کی سیکولر مساعی بھی مسائل سے دوچار ہے۔ اُنیسویں صدی میں جب مشرقی یورپ کے یہودی اہلِ فکر نے یہودیوں کو ارضِ فلسطین کی طرف مراجعت کا مشورہ دیا تھا اس وقت یہ دلیل سامنے لائی گئی تھی کہ مسیحا کی آمد کا وقت قریب ہے سو تمام دنیا کے یہودیوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین میں مسیحا کے استقبال کے لیے جمع ہوں۔ اس فقہی حیلِ نے فلسطین میں یہودی آباد کاری کے منصوبے کو ایک مذہبی تحریک کی شکل دے دی۔ جو آگے چل کر ایک سیکولر، غیر توراتی ریاست، اسرائیل کے قیام پر منتج ہوئی۔ سیکولر یہودی کوئی ساٹھ برسوں سے قومِ یہود کی مذہبی فکر میں اسرائیل کو کلیدی مقام عطا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ریاست اسرائیل میں یہودی آباد کاری کو ایک مذہبی فریضہ کے طور پر پیش کیا حتّٰی کہ آج اسرائیل کے مختصر سیاحتی سفر کو بھی عالیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ پوری دنیا کے یہودیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ان کی زندگی کا مقصدِ وحید ریاست اسرائیل کو استحکام پہنچانا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ہنگامہ خیز تحریک کے نتیجے میں دنیا کے مختلف خطّوں سے لاکھوں یہودیوں نے اسرائیل کو اپنا مسکن بنایا ہے لیکن اب ساٹھ سالوں کے بعد صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کو مہمیز کرنے کی مصنوعی کوشش بہت تیزی سے اپنا اثر کھو رہی ہے۔ اوّلاً ساٹھ سالوں کی سرتوڑ جدوجہد کے باوجود یہودیوں کی غالب آبادی اب بھی اسرائیل سے باہر ہے جس کے بغیر مسیحا کی آمد کا خیال عبث ہے۔ ثانیاً ۴۸ء میں قیامِ اسرائیل کے وقت اور ۶۷ء میں اسرائیل کی غیر متوقع فتح کے بعد اہلِ یہود کے سروں پر خدائی دستِ شفقت کا جو احساس پایا جاتا تھا، وہ مقدس بخار اب بڑی حد تک رخصت ہو چکا ہے۔ یہودیوں کی نئی نسل اسرائیل کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ سرد مہری کا شکار ہے بلکہ بعض سروے پر اگر یقین کیا جائے تو نوجوان یہودیوں (عمر ۱۸ تا ۲۹ سال) کی ایک تہائی آبادی اسرائیل سے ہجرت کرنے کی سوچ رہی ہے۔ مغرب میں پروان چڑھنے والی نئی یہودی نسل اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد ہزاروں میل دور ایک ریاست کو استحکام فراہم کرنا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ نئی نسل اسرائیلی حکمرانوں کی بدعنوانیوں اور ان کے جنگجویانہ عزائم کی بھی شاکی ہے۔ یہودی دانشوران نوجوانوں کو ٹھنڈے

یہودی (Cool Jew) کا نام دیتے ہیں۔ گویا ساٹھ سال پہلے اسرائیل کا وجود جس طرح مختلف یہودیوں کے لئے نقطۂ اتحاد تھا اور جس نے دو ہزار سالہ بے وطن یہودی شناخت کو ایک نقطۂ اتصال عطا کیا تھا اب اس کا سحر بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ یہودی تنظیمیں اس صورت حال پر ماتم کناں ہیں کہ ہندوستان میں تفریح کی غرض سے آنے والے بہت سے یہودی نوجوان پُر سکون زندگی کا لطف لینے کے بعد دوبارہ اسرائیل واپس جانا نہیں چاہتے۔

یہودی نقطۂ نظر سے اگر مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ دو سو سال کی شب و روز جد و جہد کے باوجود اہلِ یہود ابھی اپنے اہداف سے خاصے دور ہیں اور شاید اس راہ کی فقہی اور حلاقائی پیچیدگیاں آنے والے دنوں میں بھی ان کا راستہ روکے رکھیں۔ ہاں اس پورے قضیے میں یہ ضرور ہوا کہ روایت پرست عیسائی حلقوں نے مسیح کی آمد ثانی کی راہ ہموار کرنے کے لیے یہودی قوم کو مسلسل ان مسلمانوں سے نبرد آزما کر رکھا ہے جن کے سایۂ عاطفت میں یہودی قوم نے صدیوں پُر امن اور پُر سکون زندگی کا لطف لیا ہے اور جس کے تاریخی شواہد سے یہودی مؤرخین کی کتابیں بھی خالی نہیں۔ مسیح کی آمد ثانی کے شوق میں عیسائی حلقوں نے تاریخ کو جس سرعت کے ساتھ آگے لے جانا چاہا ہے اس کی سب سے بڑی قیمت اہلِ یہود کو چکانی پڑی ہے۔ ان کی مذہبی شناخت جو پچھلے دو ہزار سالوں سے (galute) یا جلاوطنی سے عبارت تھی ایک خالصتاً سیکولر، غیر توراتی ریاست کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔ ارضِ فلسطین میں یہودی حکمرانی اور آباد کاری کا سامان تو فراہم ہو گیا لیکن داؤد و سلیمان کا روحانی اور اخلاقی ورثہ قصۂ پارینہ بن گیا۔ Temple Mount پر خدا کی تقدیس کا جلوہ اب بھی ان کی رسائی سے دور ہے۔ ایک غیر توراتی ریاست اور اس کے کارندے ایک خالص مذہبی نوعیت کے پروجیکٹ میں خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ ساٹھ سال گزرنے کے بعد، اب بھی ریاست اسرائیل کے باشندے اس بنیادی سوال سے دوچار ہیں کہ وہ مختلف ملکوں سے پُر آسائش زندگی چھوڑ کر یہاں کس لیے جمع ہیں۔ مسیحا کب آئے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ عیسائی زائچہ نویسوں کے آلہ کار بن گئے ہوں جو بہر قیمت مسیح کی آمد ثانی کے لیے مشرق وسطیٰ میں ایک آرمیگاڈان برپا کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ دنوں (Harzliya) کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک نوبل انعام یافتہ یہودی عالم پروفیسر اسرائیل اومان نے اسی سنگین صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبر دار کیا تھا کہ ریاست اسرائیل فی زمانہ اپنے وجود کے خطرے سے دوچار ہے اور یہ اس صورت حال کا لازمہ ہے جسے ہم (Post-Zionism) کہہ سکتے ہیں۔

اس دوران گو کہ مسلم دنیا اہلِ یہود کے اساطیری ذہن کی مسلسل زد پر رہی ہے۔ البتہ ہماری طرف سے اس اساطیری ذہن کے مالہ و ماعلیہ کو سمجھنے کی سنجیدہ اور ہمدردانہ کوشش شاید اب تک نہیں کی گئی ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان جو نظری طور پر تمام اقوام عالم کی مسیحائی پر مامور ہیں علمائے یہود کو اس اساطیری طرزِ فکر سے نجات دلانے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہ کرتے۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ ابتدائی مراحل میں فلسطینی مزاحمت کاروں کی قیادت پر سیکولر ذہن کا غلبہ تھا جو مسئلہ فلسطین کو ایک خالص قومی جدوجہد سمجھتے تھے۔ البتہ بعد کے ایام میں بالخصوص ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب سیکولر قیادت کا اعتبار جاتا رہا اور رفتہ رفتہ اس کی جگہ دینی تنظیموں نے لے لی تو اس جد و جہد کی قیادت بڑی حد تک مذہبی قائدین کے ہاتھوں میں آ گئی جن کا موقف یہ تھا کہ ارضِ فلسطین کی حیثیت چوں کہ وقف اراضی کی ہے جس پر تمام امّت کا مشترکہ ورثہ ہے اس لیے اس سرزمین کے کسی حصّے کا بھی سودا نہیں کیا جاسکتا۔ جہادی تنظیموں نے مسئلہ کو عسکری طور پر حل کرنے کی کوشش کی جس سے بیسویں صدی میں جذبۂ شہادت کی عظیم تاریخ لکھنے میں تو ضرور مدد ملی البتہ اسرائیلی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ہدف ہنوز ایک دور افتادہ خیال ہے۔ ساٹھ سالہ کشت وخون کے بعد اہلِ یہود کو اب یہ فکر ستانے لگی ہے کہ محض قوت کے بل پر مسلسل خوف اور نفرت کے ماحول میں نہ تو کسی ریاست کی صحت مند تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ ہی نئے مستقبل کی اُمید میں پوری قوم کو بہت دنوں تک انتظار میں رکھا جاسکتا ہے۔ یہودی شدّت پسندوں میں دو ریاست کے فارمولے کی قبولیت اور فلسطینی جاں بازوں میں اس خیال کے لیے نرم گوشہ ہونا اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ دونوں طرف اس بندگلی سے نکلنے کی ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اب تک مسئلہ فلسطین پر مسلمان محض مزاحمت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کی پیش کردہ تجاویز پر ہی ردّعمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ خود ان کی طرف سے اقدامی عمل کا ڈول ڈالا جانا ابھی باقی ہے۔

شاید اب وقت آ پہنچا ہے کہ مسلمانوں کے اہلِ فکر کمال ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ یہودی ذہن کو ان اساطیری گرداب سے نجات دلانے کے لیے سامنے آئیں جس نے نہ صرف یہ کہ یہودی دنیا کو ایک سرابِ مسلسل کے تعاقب میں مبتلا کر دیا ہے بلکہ اس خیال نے توحید کی حامل دو قوموں کو گذشتہ نصف صدی سے باہم برسرِ پیکار کر رکھا ہے۔ خیر امّت کی حیثیت سے مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ علمائے اہلِ کتاب کو ان التباساتِ فکری سے نکلنے میں مدد دیں جس کے سبب آنے والے دنوں میں فلسطین کی سرزمین کے ملحمۂ کبریٰ میں تبدیل ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب مسلم

اہلِ فکر اہلِ یہود کے خدا ترس علماء کا مؤقف سمجھنے کے لیے انھیں مکالمے کی دعوت دیں۔ ہماری طرف سے اہلِ یہود کو یہ پیغام جانا چاہیے کہ ہم کوئی اور نہیں براہیمی سلسلے کے آخری امین ہیں۔ اگر تمھاری توقعات کے مطابق آنے والے دنوں میں مسیح کا واقعی ظہور ہوجاتا ہے تو ہم حضرت مسیح پر بیت المقدس کا سنہری دروازہ بند کرنے کی جسارت کیسے کرسکتے ہیں۔ کیا اہلِ یہود کے حق پرست افراد ہماری صدیوں پر محیط فیاضانہ میزبانی سے انکار کرسکتے ہیں؟ کیا وہ ہم نہیں تھے کہ جب خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کی قیادت میں فلسطین میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو Mount Morya کی عظمت کی بحالی کی خاطر اسے دوبارہ خدائے واحد کے سجدوں سے آباد کیا تھا تب ہمیں یہ گوارہ نہ ہوا کہ داؤد سلیمان کی باقیات کو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا رہنے دیں۔ وہ ہم ہی تھے جس نے ۱۳۵۹ء میں دیوارِ گریہ کی نشان دہی کی تھی اور یہ کہہ کر اسے اہلِ یہود کے حوالے کیا تھا کہ شاید یہ تمہارے معبد کی باقیات میں ہو۔ خدائے واحد کے آگے دیوارِ گریہ کے سایے میں تمھاری عبادتوں کو ہم تب بھی فال نیک تصوّر کرتے تھے اور آج بھی جب اہلِ یہود اور مسلمانوں کے مابین نفرتوں کی فصیل کھڑی ہوگئی ہے ہم تمہاری عبادتوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں اگر مسیح کا واقعی ظہور ہوگیا تو ہم ان کے لیے دل و نگاہ بچھانا اپنی خوش بختی نہ سمجھیں گے۔ گو کہ آنے والا آچکا اب وہ کبھی نہ آئے گا۔ لیکن تم ماضی کے طلسم میں گرفتار ایک خیالی دنیا کی اُمید لیے بیٹھے ہو۔

دوسری طرف کچھ یہی حال عیسائی روایت پرستوں کا ہے جو مسیح کی آمد ثانی کے لیے تمہارے ہاتھوں ملحمۂ کبریٰ برپا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مستقبل کے سلسلے میں یہ موہوم اندیشے مسلمانوں میں نہیں پائے جاتے۔ ہمارے یہاں بھی بعض حلقے مسیح کی آمد ثانی اور بعض حلقے امام غائب کے ظہور کے منتظر ہیں بلکہ بعض روایتوں کے مطابق تو انھوں نے دمشق میں سفید گنبد کے اوپر فرشتوں کے جلو میں بادلوں کے سایے میں مسیح کے نزول کی تفصیلات بھی مرتّب کر رکھی ہیں۔ تم ان باتوں کو کج فکری پر محمول کرو یا اسے حقیقت جانو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کشت و خون کے اس سلسلے کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کردیا جائے جب تک کہ مستقبل کا مطلع پوری طرح صاف نہیں ہوجاتا کہ اگر مسیح کا نزول واقعتاً دوبارہ ہوتا ہے تو تم ہمیں ان کی قیادت میں اپنے ساتھ شریک و سہیم پاؤ گے۔ قرآن کا مؤقف ہے کہ "فی قومِ موسیٰ امة یهدون بالحق" ہم پر لازم ہے کہ ہم قومِ موسیٰ کے خدا ترس نفوس کو بلا پس و پیش ایک بے تکلّف مباحثے کی دعوت دیں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے۔ یا﴿ اهل الکتاب تعالوا الیٰ کلمةٍ سواءٍ بیننا و بینکم ﴾۔



مسلمانوں میں جب یونانی علوم کے زیر اثر کلامی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا اور جب اس صورتِ حال نے ایک دانشورانہ انارکی کی کیفیت پیدا کردی تب پہلی بار یہ سوال ہمارے لیے اہمیت اختیار کرگیا کہ کون سے علوم واقعتاً مفید ہیں اور کن علوم کو لائق استراد سمجھنا چاہیے۔ شرعی اور غیر شرعی علوم کی تقسیم نے اگر ایک طرف معقولات کے سیلاب کو روکنے میں مدد دی تو دوسری طرف آگے چل کر اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بہت سے مفید علوم، علومِ شرعی کی تعریف سے باہر رہ گئے۔ علوم شرعی کا محدود تصور جس سے خود اب قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ باہر رہ گیا تھا اور جس کا انفس وآفاق میں غور فکر کی دعوت دینے والی تمام آیات احاطہ نہیں کرتی تھیں مسلم ذہن کو بہت جلد ایک ایسی بند گلی میں لے گیا جہاں سے اس کا نکلنا آج بارہ صدیوں کے بعد بھی ممکن نہیں ہوسکا ہے۔



پچھلے بھی ہماری طرح انسان تھے جنھوں نے حتّی المقدور اپنے حالات میں انبیائی پیغام کو برتنے اور اس کی تحمیل کا خاطر خواہ شرف حاصل کیا۔ ہم ان کے گرد تقدس کا ہالہ تعمیر نہ کریں تو ان کی لغزشیں ہمارے راستے میں فکری رکاوٹیں پیدا نہیں کریں گی اور ہم اپنے اندر وحی ربّانی سے اسی طرح اخذ و اکتساب کی ہمت پائیں گے جس طرح پچھلوں نے کیا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جہاں تاریخ canonization کا شکار ہوجائے اور راسخ العقیدہ فکر اس بات پر مُصر ہو کہ محمد رسول اللہ کے ساتھ ہی خلفائے اربعہ، ائمہ اربعہ، ائمہ اثنا عشر، ائمہ سبعہ وغیرہ کو بھی راسخ العقیدگی کا اظہار سمجھا جائے بھلا ایک ایسی راسخ العقیدگی کو وحی ربّانی کا صحیح شارح اور ترجمان کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

۱۲

مسئلۂ اجتہاد پر ایک اجتہادی نظر

مسلمانوں نے اپنے زوال کے مداوا کے لیے جس چیز سے سب سے زیادہ توقع وابستہ کر رکھی ہے وہ قضیۂ اجتہاد ہے ۔ گذشتہ کئی صدیوں سے ہم یہ سُنتے آئے ہیں کہ سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) کے بعد خارجی فکری یورشوں سے بچنے کے لیے اجتہاد کے جس عمل کو منجمد کر دیا گیا تھا‘ اگر اسے دوبارہ جاری کر دیا جائے تو امّت میں زندگی کی نئی رمق پھر سے پیدا ہو جائے گی ۔ ہمارے وہ اہلِ نظر جو ہمارے سیاسی زوال کی وجہ ہمارے تصوّرِ حیات کی تبدیلی میں تلاش کرتے رہے ہیں وہ بھی کم و بیش اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اجتہاد کے بند دروازوں کو از سرِ نو کھول دینا اُمّت کے لیے تقلیبِ فکر و نظر کا سامان فراہم کر سکتا ہے ۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کی مسلم فکر بنیادی طور پر اجتہاد کے اسی مبہم خاکے میں رنگ بھرنے کی ایک کوشش کہی جا سکتی ہے جس میں محمد اقبال کے خطبات کو نمایاں مقام حاصل ہے اور جس کے اثرات عصرِ حاضر کی مسلم فکر پر مسلسل پڑتے رہے ہیں ۔ البتہ اجتہاد کی یہ لَے اپنی مزعومہ فکری بلند آہنگی کے باوجود‘ واقعہ یہ ہے کہ کسی واقعی تقلیبِ فکر و نظر (paradigm shift) میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے ۔ خطباتِ اقبال کی طباعت کو کوئی پَون صدی بیت چکی ہے لیکن اب بھی مسلم اہلِ فکر کے مابین اجتہاد کی حیثیت ایک عملی ادارے کے بجائے ایک رجائی علمی مطالبے کی ہے اور بس ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جس اجتہاد کی شدید ضرورت پر ہمارے اہلِ فکر متفق نظر آتے ہیں اور جس بابِ اجتہاد کو کھولنے کی مہم کم از کم گذشتہ دو صدیوں

سے زور وشعور سے چلائی جاتی رہی ہے وہ ان تمام تر کوششوں کے باوجود ہنوز بند نظر آتا ہے۔ اگر صدیوں پر مشتمل اجتہادی کاوشیں ہمیں کوئی واضح فکری رہنمائی فراہم کرنے میں ناکام ہیں اور اگر ان کے نتیجے میں کوئی نئی دنیا پیدا نہیں ہوتی تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتہاد کے سلسلے میں مروّجہ تصوّرات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تب ہی یہ پتہ چل سکتا ہے کہ پانی مرتا کہاں ہے۔

اجتہاد بنیادی طور پر ایک فقہی تصوّر ہے۔ یہ سمجھنا کہ نئے اجتہاد سے ہمارے فکری بحران کا مداوا ہوسکتا ہے دراصل اس خلط مبحث کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے فکری بحران کو بنیادی طور پر ایک فقہی قضیہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ ہمارا نظری بحران جس نے ہمارے اجتماعی سفر کا رُخ بدل کر رکھ دیا ہے' بنیادی طور پر فکری ہے فقہی نہیں۔ ہم اس حقیقت سے مسلسل نگاہیں بچاتے رہے ہیں کہ اجتہاد کے جس مروّجہ ادارے کو ہم مہمیز کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی سرشت میں ایسے عوامل رکھتا ہے جہاں ایک قدم آگے بڑھانا اور دو قدم پیچھے کی طرف چلنا اس فکری رویّے کا شیوہ ہے پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اجتہاد کی یہ بیل منڈھے چڑھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک سرابِ مسلسل ہماری فکری زندگی کا علامیہ بن کر رہ گیا ہے۔ آیئے اس نکتے کی قدرے وضاحت کی جائے۔

اجتہاد کا مروّجہ تصوّر راسخ العقیدہ فقہی ذہن کا توسیعہ ہے۔ صدیاں گزریں ہمارا فقہی منہج واصل بن عطا کے اصولِ اربعہ کا اسیر ہے جہاں قرآن مجید کے بالمقابل مآخذ کے طور پر احادیث، اجماع اور قیاس کو یکساں اہمیت دے دی گئی ہے۔ اجتہاد جو دراصل قیاس یا رائے کی ہی ایک شاخ ہے۔ دیکھا جائے تو بڑی حد تک اس پُرانے ذہن اور پُرانے فکری ڈھانچے کا مرہون منّت ہے۔ نئے مجتہدین اگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی نیا ذہن بنانے میں ناکام رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صدیوں سے رائج اصولِ اربعہ کے اس شاکلے کو توڑنے کی اپنے اندر ہمّت نہیں پاتے۔ جس فکری چوکھٹے میں قرآن مجید کے بالمقابل آثار و روایات، قدماء کے اجماع اور ان کے قیاس کو تقدّس کا درجہ حاصل ہوگیا ہو بھلا اس سے کیوں کر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی نیا ذہن اور نئے آسمان کی تشکیل پر منتج ہوگا۔

مسئلہ کی تفہیم کے لیے لازم ہے کہ ہم کسی قدر گہرائی سے اس سوال کا جائزہ لیں کہ اجتہاد جس فکری شاکلے کا جزو لاینفک ہے اس کی تعمیر وتشکیل میں کن عوامل نے حصّہ لیا ہے۔ راسخ العقیدہ مسلم فکر جو پندرہ صدیوں کے تاریخی سفر کے بعد ہم تک پہنچی ہے اور جو یہ سمجھتی ہے کہ فقہائے قدیم کے اصول اربعہ کو برقرار رکھتے ہوئے بعض جزوی اصلاحات کے ذریعہ صورتِ حال میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے اپنے تاریخی سفر میں

اخذ و اکتساب کے اتنے مراحل سے گزری ہے کہ آج اس کا اپنے اصل پر واپس لے جانا ایک خیال عبث معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک صدیوں کے تاریخی انحرافات کی بے لاگ نشاندہی نہ کی جائے اجتہاد کی تمام تر کاوشیں تقلید و انجماد کا توسیعہ بن کر رہ جائیں گی ۔

اس خیال کی صداقت سے انکار مشکل ہے کہ مروّجہ اسلام کی جو تصویر آج ہمیں نظر آتی ہے اسلام کے اس قالب کی تشکیل میں اقوامِ مسلم کے تہذیبی سفر کو بھی خاصا دخل رہا ہے ۔ اسلام کی وہ آفاقی دعوت جو محمد رسول اللہ کے ذریعے جزیرۃ العرب میں گونجی تھی وہ انبیائی لب ولہجہ وحی ربّانی کے صفحات میں اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ آج بھی موجود ہے البتہ مروّجہ اسلام جو فقہا کے دواوین، متصوفین کے ملفوظات، مفسرین کی لاطائل تعبیرات اور محدثین کی ثقہ و غیر ثقہ معلومات کے ذریعے تشکیل پایا ہے اس نے آفاقی پیمبرانہ پیغام کا قالب بڑی حد تک بدل کر رکھ دیا ہے ۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ فقہائے قدیم کی تعبیرات میں حک و ترمیم کے ذریعے ہم نئی صورتِ حال کا مقابلہ کر سکتے ہیں، دراصل اسلام کی اصل قوت سے ناواقفیت اور انبیائی لب و لہجے سے بے خبری کا نتیجہ ہے ۔

ابتدائی عہد میں حالات نے جو رخ اختیار کیا اس کے نتیجے میں جنگِ ردّہ، قتل عثمان ، جنگِ جمل اور جنگِ صفین جیسے واقعات پیش آئے ۔ آنے والے دنوں میں اموی اور عبّاسی حکومتوں کی راہ ہموار ہوئی ۔ ان دل گرفتہ واقعات سے متوحش ہوکر ہمارے متکلّمین اور مؤرخین نے اکثر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست میں اس بنیادی تبدیلی کے باوجود اسلام کو بحیثیت پیغام زوال نہیں آیا ۔ ہوسکتا ہے یہ خیال کسی حد تک صحیح ہو، البتہ اس خیال کو تقویت پہنچانے کے لیے لازم نہیں کہ ہم اموی اور عباسی حکومتوں کو بھی پیغمبرانہ اسلام کا نقیب باور کرائیں ۔ ہمارے خیال میں بالکل ابتدائی عہد میں اس قسم کے دل گرفتہ واقعات دراصل اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پیمبرانہ دعوت اور قدسی نفسوں کا گروہ تاریخ کے کسی بھی مرحلے میں ملائک جیسی خصلتوں کا اظہار نہیں کر سکتا کہ اگر ایسا ہوتا تو مستقبل کے بشری معاشرے کے لیے اس پیغام کی قدر و قیمت مشکوک ہوجاتی ۔ پچھلے بھی ہماری طرح انسان تھے جنھوں نے حتّی المقدور اپنے حالات میں انبیائی پیغام کو برتنے اور اس کی تحمیل کا خاطر خواہ شرف حاصل کیا ۔ ہم ان کے گرد تقدس کا ہالہ تعمیر نہ کریں تو ان کی لغزشیں ہمارے راستے میں فکری رکاوٹیں پیدا نہیں کریں گی اور ہم اپنے اندر وحی ربّانی سے اسی طرح اخذ و اکتساب کی ہمت پائیں گے جس طرح پچھلوں نے کیا ۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جہاں تاریخ canonization کا شکار ہوجائے اور راسخ العقیدہ فکر اس بات پر مُصر ہو کہ محمد رسول اللہ کے ساتھ ہی

خلفائے اربعہ، ائمہ اربعہ، ائمہ اثنا عشر، ائمہ سبعہ وغیرہ کو بھی راسخ العقیدگی کا اظہار سمجھا جائے اور جہاں تاریخ لکھنے کا یہ انداز ہو کہ سلسلۂ خلفاء میں اموی خلیفہ عبدالملک کی حکمرانی کا ذکر تو ملتا ہو لیکن عبداللہ بن زبیر کی ساڑھے نو سال کی حکمرانی طاقِ نسیاں کی زینت بنا دی گئی ہو اور جہاں بیک وقت اموی، عبّاسی اور فاطمی خلافتوں کو نظری استحقاق فراہم کیا گیا ہو اور یہ سب کچھ راسخ العقیدہ مذہبی ذہن کی تشکیل میں قابل استناد سمجھے گئے ہوں بھلا ایک ایسی راسخ العقیدگی کو وحی ربّانی کا صحیح شارح اور ترجمان کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

واصل کے اصول اربعہ پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ واصل جن کا معتزلی ہونا کبھی باعث اعتراض سمجھا جاتا تھا ایک ایسے عہد کی پیداوار تھے جب دانشِ یونانی کے اثرات نے مسلم فکر میں ہلچل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کلامی بحثیں' ایسا محسوس ہوتا تھا انبیائی پیغام کا قالب بدل کر رکھ دیں گی۔ مرجیۂ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ اور ان جیسے بے شمار فرقوں نے عقائد کے سلسلے میں دقیق پیچیدہ بحثوں کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ قرآن جیسے بنیادی وثیقے کے سلسلے میں یہ بات معرضِ بحث تھی آیا وہ مخلوق ہے یا قدیم۔ آنے والے دنوں میں گو کہ اس کلامی طرزِ فکر پر کسی حد تک روک لگا دی گئی البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان مباحث کے زیرِ اثر وحی ربّانی کے سلسلے میں عام ذہنوں میں مختلف نوعیّتوں کے التباسات پیدا ہو گئے۔ یہ سوال کہ ترسیلِ وحی کی ماہیت کیا ہے؟ خدا کا کلام (Divine Intent) انسانی زبان میں کس طرح متشکّل ہوتا ہے؟ کلمۃ اللہ بمعنی Logos سے متعلق یونانی، عیسائی مباحث بھی ہمارے اہلِ فکر کی توجہ کا مرکز بنے۔ وحی کی ماہیئت کے سلسلے میں قرآن مجید نے امر ربّی کہہ کر جس غیر ضروری بحث کا دروازہ بند کر دیا تھا اسے دوبارہ کھولنے سے ہوا یہ کہ عام ذہنوں میں وحی ربّانی کی وہ مرکزی اور ناقابلِ چیلنج حیثیت متزلزل ہو گئی۔ قرآن مجید کو supreme authority کے بجائے دوسرے قابلِ اعتماد ماخذ کی طرح ایک ماخذ کی حیثیت دے دی گئی۔ واصل بن عطا جو اپنے عہد کے کلامی مباحث کا گہرا شعور رکھتے تھے' انھوں نے غور وفکر کے لیے جو شاکلہ ترتیب دیا اس میں قرآن مجید کے ساتھ ساتھ سنّت' اجماع اور قیاس کو بھی کلیدی اہمیت کا حامل بتایا۔ رفتہ رفتہ واصل کا یہ علمی منہج فقہاء کے مابین قبولیت عامہ اختیار کر گیا۔ آنے والے دنوں میں جب اصولِ فقہ پر باقاعدہ کتابیں لکھی جانے لگیں کسی کو اس بات کا خیال کم ہی آیا کہ قرآن مجید کے علاوہ دوسرے تینوں ماخذ میں وحی ربّانی کی تابانی کے بجائے دانش انسانی کا ظہور پایا جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے کہ تاریخ کے مختلف عہد میں سنّت کا تصوّر تغیّر پذیر رہا ہے۔ رہا اجماع تو کسی معاملے پر اجماع کا دعویٰ کسی مغالطے سے کم نہیں۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ پچھلوں کا

اجماع اگلوں کے لیے حق کی کسوٹی نہیں بن سکتا کہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمر کے لیے یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ عہد رسول کی بہت سی نظیروں کے برخلاف اپنے حالات کے مطابق نئے فیصلوں کی جرأت کرتے۔ رہا قیاس جس کے ضمن میں اجتہاد، استحسان، مصالح مرسلہ اور دوسری فقہی اصطلاحات آتی ہیں تو ان کا متنازع فیہ ہونا اہلِ علم پر واضح ہے۔ ہماری بہترین فقہی کاوشیں چوں کہ صدیوں سے اسی اصولِ اربعہ کے گرد گردش کرتی رہی ہیں جس میں وحی ربّانی کی تجلّیوں کو کہیں روایات کا تابع کرنے کی کوشش ہے تو کہیں مفروضہ اجماع اس سے راست اکتساب پر روک لگادیتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قیاس یا اجتہاد کے نام پر کوئی کوشش اس بنیادی شاکلے کو توڑ سکے جس کا وہ خود مرہونِ منّت ہو۔

ماضی میں قرآن مجید سے راست اکتساب کی جو تحریکیں چلی ہیں وہ کوئی نیا شاکلہ بنانے میں اگر ناکام رہیں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اجماع اور قیاس سے بغاوت کے باوجود ان کے ہاں بھی قرآن مجید کو اس مقامِ عظمت پر فائز کرنا ممکن نہ ہوا جس کا کہ قرآن سزاوار تھا۔ اصلاح کا دعویدار یہ گروہ جو خود کو غیر مقلّدین میں شمار کرتا تھا فقہائے متکلّمین کے بجائے فقہائے محدثین پر انحصار کے لیے خود کو مجبور پاتا تھا۔ کسی ابو حنیفہ یا کسی شافعی کے مقابلے میں صحاح ستہ یا کتب تسعہ پر انحصار سے یہ خوشگوار تاثر تو ضرور قائم ہوتا تھا کہ ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کی فہم وبصیرت پر انحصار کے بجائے راست عہد نبوی کے آثار وایّام سے اکتساب کررہے ہیں البتہ احادیث کے وسیع ذخیرے میں بعض ناقابلِ عمل، متروک اور بسااوقات ناقابلِ فہم روایتوں کے بیان سے یہ حضرات اس قدر متوحش ہوئے کہ ان روایتوں پر عمل تو درکنار ان کا تنقیدی محاکمہ کرنے کی بھی ان میں جرأت پیدا نہ ہوسکی۔ جس طرح مقلّدین اپنے ائمہ فقہا کو تقدس کے ہالے میں گھرا دیکھتے تھے کچھ یہی کیفیت غیر مقلّدین کے ذہنوں میں فقہائے محدثین کے سلسلے میں پیدا ہوگئی تھی۔ حدیث پر راست عمل کے دعوے داروں کے لیے صحیح مسلم میں موجود خمرۂ نماز یا متعہ کی روایتوں کو قبول کرنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ عقل وشائستگی سے پرے بعض ایسے بیانات کو منشورِ عمل بنا سکیں جن پر وہ سنّت سے راست اکتساب کے شوق میں ایمان لے آئے تھے۔ مثال کے طور پر کس میں اس بات کا یارا تھا کہ وہ کسی بالغ آدمی کو اپنے گھر میں بلا روک ٹوک داخلے کے لیے اپنی ساس یا اپنی بیوی کا دودھ پلواتا کہ اس طرح وہ رشتے کی قربت کی وجہ سے گھر میں بلا روک ٹوک داخل ہوسکے۔ روایتیں بتاتی ہیں، جیسا کہ امام احمد اور امام مسلم نے نقل کیا ہے، ایک مرتبہ ابوحذیفہ کی بیوی نے رسول اللہ سے پوچھا کہ سالم ہمارے گھر میں آتا ہے وہ بالغ آدمی ہے اور ابوحذیفہ کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے۔ کتب احادیث کی ان روایتوں

کے بقول رسول اللہ نے فرمایا کہ اسے دودھ پلا دو تا کہ وہ گھر میں داخل ہو سکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عائشہ کسی شخص کے متعلق چاہتیں کہ وہ ان کے گھر میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکے تو وہ اپنی بہن امّ کلثوم یا اپنی کسی بھتیجی کو حکم دیتیں کہ وہ پانچ مرتبہ اسے اپنا دودھ پلا دیں۔ (فتح القدیر۔۷/۳)

جو لوگ سنّت کے نام پر کتب احادیث کے مجموعوں پر ایمان لے آئے تھے اور جو راویانِ احادیث کو بمنزلہ جبرئیل سمجھنے پر مُصر تھے ان کے لیے ان جیسی بے شمار روایتوں کو مسترد کرنا ممکن نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قیاس اور اجماع کے استزاد کے باوجود ان کی تمام تر تگ و تاز کا محور لا ئنحل اور متضاد روایتیں بن کر رہ گئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ فقہ حنبلی میں، جس کے خیمے سے روایتی فقہ کے خلاف تاریخ کے مختلف ادوار میں علم بغاوت بلند ہوتا رہا ہے، فقہائے احناف اور شوافع کی طرح دقیق پیچیدگیاں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میدانِ فقہ میں یدطولیٰ رکھنے والے حضرات، احمد بن حنبل کو بحیثیت فقیہہ تسلیم کرنے پر کم ہی آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن سپاٹ لفظی تعبیر اور سادہ لب و لہجہ کے باوجود وحی ربّانی کو روایتوں کا تابع کر دینے کی وجہ سے حنابلہ کے ہاں بھی کسی تخلیقی فہم یا راست اکتساب کی صورت حال پیدا نہیں ہو پائی۔ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب اگر مجدّ دین کی حیثیت سے اپنے مشن میں ناکام نظر آتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ مروّجہ منہج فقہ کی نکیر کے باوجود اجماع اور روایتوں کے حصار کو عبور کرنے کا یارا نہیں رکھتے۔ تاریخ کی انسانی تحفیظ و تعبیر کو ان کے یہاں بھی تقدیسی مقام حاصل ہے جسے وہ پیرویٔ سلفِ صالح سے تعبیر کرتے ہیں۔ دل و دماغ کو اگر قدماء کی آرا اور ان کی فہم کا تابع کر دیا جائے اور یہ خیال عام ہو کہ ہماری ہر تعبیر کی صحت کے لیے لازم ہے کہ وہ سلفِ صالحین کی پُرانی تعبیرات کا لازماً پرتو ہو تو پھر وحی ربّانی سے راست اکتساب کا موقع کہاں رہ جاتا ہے؟

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ابتدائی دو صدیوں میں فقہ کی تشکیل اور اس کا ارتقاء جس فکری ماحول میں ہوا اس عہد کے علمی منہج اور کلامی طریقۂ گفتگو پر فقہی اسلوب خاصا نمایاں ہے۔ اگر ایک طرف دانشِ یونانی اور Logos کے بارے میں عیسائی تصوّر مسلم فکر سے مزاحم ہو رہی تھی تو دوسری طرف اہلِ یہود کا علمی سرمایہ اور ان کے یہاں مذہبی تشریح و تعبیر کی مستحکم روایت بھی مسلمانوں کے نو تعمیر شدہ علمی دبستانوں کو متاثر کر رہی تھی۔ کسی فقیہہ اور محدث کے لیے اپنے شاگردوں کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ اب بذاتِ خود مسندِ ارشاد پر فائز ہو سکتے ہیں یا یہ کہ انفرادی علماء کے لیے اس خیال کا قبولِ عام حاصل کر لینا کہ وہ اب کسی مسئلہ پر باضابطہ فتویٰ صادر کر سکتے ہیں، اس قبیل کے ادارے اگر بعد کے عہد میں متشکّل ہوتے گئے تو اس

کی ایک بڑی وجہ اہلِ کتاب کا علمی منہج اور ان کے یہاں پائی جانے والی سلسلۂ شیوخ کی مستحکم روایت تھی۔

ابتدائی عہد میں سیاسی نظام کے متزلزل ہوجانے اور موروثی حکومتوں کے قیام کے سبب، جو اپنے استحقاق کے لیے علما کے پرائیوٹ انسٹی ٹیوشن کا سہارا لینا مناسب سمجھتے تھے، اسلام میں سلسلۂ شیوخ کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ بہت جلد ان شخصی دبستانوں اور پرائیوٹ علماء نے ایک ایسے اسلام کی تشریح وتعبیر کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا جس پر جمہور مسلمان متفق ہوسکیں۔ دیکھتے دیکھتے صرف دوصدیوں کے اندر دینِ مبین میں فرقوں کی بہار آ گئی۔ فقہائے متکلّمین جب اپنے وضع کردہ پیمانوں سے دوسروں کا ایمان ناپنے کے لیے نکلے تو انھیں اپنے علاوہ کسی کو مسلمان باور کرنا مشکل ہوگیا۔ کلامی بحثوں کے زیرِ اثر جہاں مختلف فرقے پیدا ہوئے وہیں ایک تعبیر کے رد میں مسلسل دوسری تعبیر بھی سامنے آتی رہی۔ تحریکِ اعتزال کے پیدا کردہ فکری بحران پر بندھ باندھنے کے لیے ابوالحسن اشعری سامنے آئے جنھوں نے مروجہ کلامی اسلوب میں جمہور مسلمانوں کے لیے ایک قابلِ قبول اسلام کا منشور تیار کیا۔ آنے والے دنوں میں اشعری کا تعبیرِ اسلام ایسی ثقاہت کا حامل ہوگیا کہ اس کی حیثیت راسخ العقیدہ مسلم فکر کی ہوگئی۔ مسلم فکر پر اشعری کے اثرات اتنے گہرے پڑے کہ آنے والی کئی صدیوں میں عرض اور جوہر کی بحث سے پیچھا چھڑانا ممکن نہ ہوسکا۔ گو کہ بعد کے عہد میں بھی ایسے مواقع آئے جب اشعری کے مخالفین نے مسجد کے منبروں سے گاہے بگاہے ان پر لعن طعن کا سلسلہ جاری رکھا، البتہ آنے والے دنوں میں غزالی (متوفی ۵۰۵ھ) اور فخرالدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی کاوشوں کے طفیل اشعریت کو بڑی حد تک فتح حاصل ہوگئی۔ کتاب الابانہ عن اصول الدّیانہ میں اشعری نے عقائد کا جو چارٹر تیار کیا اس میں کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ، آثارِ صحابہ اور ائمہ محدثین کے ساتھ ہی خصوصیت کے ساتھ احمد بن حنبل کا بھی تذکرہ ہے، جنھیں ان کے خیال میں اللہ نے طریقۂ ہدایت سے نوازا ہے: جن کے ذریعے راہِ حق کی وضاحت کی، بدعتوں کا قلع قمع کیا، دین کو فرقہ بندی سے نجات دی وغیرہ وغیرہ۔ متفقہ اسلام کی تلاش میں احمد بن حنبل پر غیر معمولی انحصار اگر ایک طرف اس خیال کی غمازی کرتا ہے کہ تدوینی عہد کے متکلّمین، جنھوں نے تعبیر کا بنیادی فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی متقدمین کے سلسلے میں اپنے اندر کسی محاکے کا یارانہ رکھتے تھے۔ آنے والے دنوں میں ساری معرکہ آرائی کا انحصار اس بات پر تھا کہ کس علمی دبستان اور کس تعبیری قالب کو زیادہ پُر زور مبلغ ہاتھ آجاتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اشعریت کی مکمل فتح الغزالی کی مرہونِ منّت ہے جن کی احیاء العلوم عوامی اسلام کا منشور کہی جاسکتی ہے۔ گو کہ غزالی کو اپنے عہد میں سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، مختلف بلاد و امصار میں عوامی غیظ وغضب کی وجہ

سے ان کی کتابیں جلائیں گئیں لیکن آنے والے دنوں میں انھیں اسلام کے عظیم شارح اور حجت الاسلام کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔

راسخ العقیدہ مسلم فکر کی تشکیل و تدوین میں ان خالص فلسفیانہ مباحث کے عمل دخل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کا اجنبی ماخذ سے آنا ہر خاص و عام پر واضح تھا لیکن سماجی اعتبار سے ان کی توقیر اتنی بڑھ گئی تھی کہ اہلِ علم اپنے لیے اس کا حصول لازم خیال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد عبّاسی میں ایک لبنانی عیسائی نے *Enneads* کا عربی ترجمہ شائع کیا تو اسے علمی حلقوں میں اتنی اہمیت حاصل ہوگئی گویا وہ بھی کوئی آسمانی کتاب ہو جس سے کماحقہ واقفیت کے بغیر اہلِ علم کا اعتبار قائم نہیں ہوسکتا۔ ابتدائی چار صدیوں میں راسخ العقیدہ مسلم ذہن کا ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل پا چکا تھا جہاں علمِ کلام فلسفہ کا اسلامی قالب تھا جب کہ فلسفہ سیکولر دانشوروں کا میدان سمجھا جاتا تھا۔ البتہ آگے چل کر فلسفہ اور کلام کے مابین حد فاصل برقرار نہ رہ سکا۔ فلسفہ چوں کہ مختلف اسلوب میں مسلم فکر کا شارح بھی تھا اور اس سے مزاحم بھی اس لیے علمائے اسلام کے لیے اس سے دامن بچانا ممکن نہ تھا۔ دمشق کے ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸) نے ارسطا تالیسی فلسفہ کی رد میں پُر زور تحریریں لکھیں۔ فلسفہ، جو کندی (متوفی ۸۷۰) اور فارابی (۸۷۳-۹۵۰) کے عہد میں حاشیے پر تھا' ابن سینا کی علمی اور سماجی حیثیت کے سبب اسے قبولیت عامہ مل گیا۔ ابن سینا کے First Cause کی منطقی تعبیر نے' ایسا محسوس ہوا' فلسفہ کو ایک معاون اسلامی علم کی حیثیت دے دی۔ ابن حزم (۹۹۵-۹۶۵) اور غزالی (۱۰۵۷-۱۱۱۱) نے اس خیال کی عملی تصدیق کی کہ فلسفے کو تلاشِ حق میں ایک معاون علم کی حیثیت سے بطریق احسن برتا جاسکتا ہے۔ ابن بجّا (متوفی ۱۱۳۹) جن کی دانشوری ایک طرح کا متصوّفانہ رنگ لیے ہوئے ہے اور ابن طفیل (متوفی ۱۱۸۵) جو اپنی تالیف حی بن یقظان میں عقل وفطرت کی روشنی میں علمی سفر کی وکالت کے لیے معروف ہیں راسخ العقیدہ ذہن کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ ابن رشد جنھیں تصوّف کی مخالفت میں جلاوطنی اور عتاب کا سامنا کرنا پڑا، فلسفہ کو فکر اسلامی کے مرکز میں لے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن مجید کی تشریح وتعبیر کا حق اوروں کے مقابلے میں اہلِ فلسفہ کو کہیں زیادہ ہے، وحی اور انسانی علوم تلاشِ حق میں ایک دوسرے کے معاون ہیں، ایک دوسرے سے مزاحم نہیں۔ ابن رشد کی کوششوں کے باوجود فلسفہ مسلم فکر میں وہ مقام تو حاصل نہ کرسکا البتہ غزالی نے جو اسے دیس نکالا دیا تھا اس شدت میں کسی حد تک کمی آگئی۔ ابن سینا کے دو اہم شارحین فخرالدین رازی اور ناصرالدین طوسی (۱۲۰۱-۱۲۷۴) نے مسلم فکر میں اپنی جگہ بنائے رکھی۔ بلکہ طوسی کی اخلاق ناصری کو تو اس حد تک اعتبار حاصل ہوگیا کہ وہ عرصہ ہائے دراز تک

اسلامی درسگاہوں میں داخلِ نصاب رہی۔ مسلم ذہن کے اس شاکلے کی تشکیل میں متصوفین کے رول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ہم یہاں سہروردی (۱۱۵۵-۱۱۹۱) اور ابن عربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰) کے تذکرے پر اکتفا کریں گے۔ اوّل الذکر زرتشت افلاطون اور ابن سینا سے اثر پذیری کے لیے معروف ہیں تو ثانی الذکر بین المذاہب ماخذ سے عطر کشید کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ راسخ العقیدہ حلقوں میں مختلف ادوار میں قوت القلوب، احیاء العلوم، عوارف المعارف اور مثنوی مولانائے روم کو مذہبی کتابوں کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ جس طرح معاصر دنیا میں ابن تیمیہ، شوکانی اور ابن عبدالوہاب کی تالیفات سلفی ذہن کی تشکیل میں مؤثر سمجھی جاتی ہیں، جس طرح قطب اور مودودی کی تالیفات اسلامیین کے لیے ذہنی غذا فراہم کرتی ہیں، جس طرح بزرگوں کے مجیر العقول ملفوظات خانقاہی ذہن کے لیے تیر بہ ہدف سمجھے جاتے ہیں اور جس طرح فضائل اعمال کی خوش کن ضعیف روایتوں کے سہارے معصوم تبلیغی ذہن تشکیل پاتا ہے اسی طرح ماضی کی مسلم دانشوری اپنے تمام ابعاد و اثرات اور خارجی عوامل کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلم شاکلے کی تشکیل میں ممد و معاون رہی ہے۔

مسلم ذہن کو اس کی اصل پر لوٹانے، بالفاظ دیگر وحی ربّانی کی ضیا پاشیوں سے راست منوّر کرنے' کے لیے لازم ہوگا کہ ہم اس مروّجہ ذہنی ڈھانچے اور فکری شاکلے پر ضرب لگائیں جس کی تشکیل میں وحی ربّانی سے کہیں زیادہ مختلف خارجی عوامل و عناصر کارفرما رہے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ محض فقہی شاکلے میں معمولی ترمیم و تنسیخ ہمیں دوبارہ کتاب اللہ کی طرف لوٹا سکتی ہے' ان تاریخی حقائق سے صرف نظری ہوگی جن کا ہم نے سطور بالا میں تذکرہ کیا ہے۔ اجتہاد اسی وقت کارگر اور نتائج افزاء ہوسکتا ہے جب وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں در آنے والے التباسات فکری کی بے لاگ نشان دہی کا یارا رکھتا ہو۔ اس کے برعکس جس اجتہاد میں سلف صالحین، فقہائے متقدمین، راویانِ آثار و ایّام اور مزعومہ صلحائے متصوفین کے دعاوی کو چیلنج کرنے کا یارا نہ ہو، وہ نئے نتائج پیدا نہیں کرسکتا۔ اجتہاد کا یہ تصوّر کہ وہ روایتی فقہ کے اصول اربعہ کے ایک جز کی حیثیت سے متحرک رہے ایک انتہائی گمراہ کن مغالطہ ہے۔ جو لوگ واقعی اجتہاد کے خوگر ہوں اور جو یہ چاہتے ہوں کہ ایک بار پھر وحی کی تجلّیاں ہماری راہوں کو منوّر کریں انھیں چاہیے کہ وہ اجتہاد کے مروّجہ تصوّر پر ایک اجتہادی نگاہ ڈالیں۔ اگر شافعی اور حنفی اصول فقہ بسا اوقات ایک دوسرے کے ناقد اور ایک دوسرے سے متصادم ہوسکتے ہیں اور اگر ایک حلقے کا فقیہہ دوسرے حلقے کے اصول و مبادی کے سلسلے میں ناقدانہ طرز فکر اختیار کرسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عصر حاضر کے مجتہدین ان تمام مکتبۂ فکر کے اصول و منہج کے سلسلے میں

اپنے اعتراضات میں تکلّف سے کام لیں۔ نئے مجتہدین کے لیے لازم ہوگا کہ وہ نہ صرف یہ کہ روایتی فقہ کے اراکین اربعہ کو تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنائیں بلکہ انھیں اس بنیادی فکری شاکلے پر ضرب لگانی ہوگی جس کا ایک محدود اظہار ہماری روایتی فقہی ژزف بینی میں ہوتا رہا ہے۔

۱۳

ایک فکری دھماکے کی ضرورت

قوموں کی زندگی میں نشیب وفراز کا آنا ایک بات ہے اور تقلیب فکرونظر کا پیدا ہوجانا بالکل ہی دوسری بات۔ اول الذکر جہاں صورتِ حال کے تسلسل کا اعلامیہ ہے وہیں ثانی الذکر اس بات سے عبارت ہے کہ اب آگے امکانات کی ایک نئی دنیا بس پیدا ہوا چاہتی ہے۔ حالیہ دنوں میں عرب شاہراہوں پر یـــــا نـصـرالـلـه یاحبیب اضرب اضرب تل ابیب کی جومخمور کن صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اس سے بظاہر یہی محسوس ہوتا رہا کہ آنے والا آچکا ہے جو اپنے جذبۂ ایمانی اورعزم واستقامت کے بل بوتے پر اپنے سے کہیں بڑی، منظّم اور مسلح قوت پر فتح پانے والا ہے۔ مسلمان جوصدیوں سے اپنے زوال کے سد باب کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں وہ امید کا کوئی موقع کھونا نہیں چاہتے۔ لیکن کیا مزاحمت کے اس طریقہ کار میں واقعی اتنے امکانات ہیں کہ اس راستے پر چل کر آنے والے دنوں میں امت مسلمہ کی دوبارہ تنصیب امامت ممکن ہوسکے؟

یہ خیال کہ اگر ساری دنیا کے مسلمان اسرائیل پر ایک بالٹی پانی ہی ڈال دیں تو ریاست اسرائیل دنیا کے نقشے سے بہہ جائے گی، ایک شاعرانہ استعارہ تو ہوسکتا ہے جو یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آخر ساری دنیا کے مسلمانوں کو ریاست اسرائیل پر محض ایک بالٹی پانی ڈالنے کی توفیق کیوں نہیں ہوتی؟ جن لوگوں کی زندگیاں عالمی استعمار کے ہاتھوں جہنم بن گئی ہوں جو حالات کے دباؤ سے تنگ آکر فکری انارکی کی راہ پر

چل نکلنے حتیٰ کہ خودکش دھماکوں کا راستہ اختیار کرنے پر بھی خود کو مجبور پاتے ہوں، آخر کیا بات ہے کہ وہ اس بے ضرر شاعرانہ نسخہ پر عمل نہیں کرتے؟ جس چیز نے امت کے بہترین دماغوں کو صورتِ حال کے حقیقی ادراک سے روکے رکھا ہے اس میں ان اصطلاحوں کا بھی اہم رول ہے جن کی جڑیں حقیقی زندگی کے بجائے عالم خیال میں پائی جاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اصطلاحات اور الفاظ سے اپنا دامن بچائیں جو حالات کی سنگینی پر پردہ ڈالنے کے لیے وضع کی گئی ہیں۔

مسلم علماء و دانشوروں پر ہی کیا موقوف دیکھا جائے تو پوری امت مسلمہ، ان کے درجنوں ممالک اور ان کے حکمراں صدیوں سے ایک عالمِ خیال میں جی رہے ہیں۔ وہاں جو کچھ نظر آتا ہے وہ در اصل ہوتا نہیں۔ مثلاً بظاہر تو یہ محسوس ہوگا کہ عالم اسلام ایک بھرپور زندگی کی چہل پہل سے معمور ہے۔ حکمرانوں کے ایوان قوت وسطوت کے امین ہیں اور محراب ومساجد میں روحانی زندگی کا کاروبار شوق وشغف سے جاری ہے۔ لیکن اگر آپ کی نگاہیں ظاہری سطح سے نیچے دیکھ سکیں تو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ سب کچھ ایک فرسودہ طلسم کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم مدتوں سے اس طرز زندگی کے اتنے خوگر ہو گئے ہیں کہ ڈرامے کے یہ تمام کردار اب ہمیں اصل دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے علماء ومفکرین ہوں یا حکمراں یہ سب کے سب تمثیلی کرداروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایکٹ کے خاتمے پر فجر جدید کی آمد کا جو مژدہ سنایا جاتا ہے وہ پردہ گرتے ہی اپنے تمثیلی کرداروں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہوجاتا ہے اور ہماری عملی زندگی کا عذاب جوں کا توں جاری رہتا ہے۔

سچ پوچھئے تو من حیث الامۃ ہم ایک fake world یعنی تمثیلی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں۔ مجھے گاہے بگاہے ایسے محلات میں جانے کا موقع ملتا رہا ہے جن کے در و دیوار قیمتی دھاتوں سے مرصع کئے گئے تھے جن پر اعلیٰ درجے کی مینا کاری کے سبب نگاہیں ٹھہرتی نہ تھیں، ایک ایک محل کی قیمت اربوں ڈالروں میں بتائی جاتی ہے اور خود ان کے انتظامات پر جتنی بڑی رقم صرف ہوتی ہے اس بجٹ میں عالمی سطح کی کئی یونیورسٹیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ میں نے ان حکمرانوں کے ابرو اشارے کے مظاہر بھی دیکھے ہیں کہ کس طرح ان کی ایک جنبش نظر پر کارندے دوڑے پڑتے ہیں، اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کے اشارے میں اتنی قوت ہے جو ایک دنیا کی تقلیب کے لیے کافی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بیچارے اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ نہ یہاں کوئی بادشاہ ہے نہ کوئی فوج، اور نہ ہی کوئی خود مختار ملک ہے جس کا اقتدار اعلیٰ

کسی آزاد قیادت کے ہاتھوں میں ہو۔ کچھ یہی حال مذہبی زندگی کا بھی ہے جو بظاہر مادی آلائشات سے دورتر بوش بردار علماء اور ظاہر پرست مشائخ کی چلت پھرت سے قائم ودائم دکھائی دیتی ہے۔ یہاں بھی کوئی فقیہ ہے تو کوئی مفتی اعظم ،کوئی شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہے تو کسی کو امیر الامت ہونے کی غلط فہمی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس تمثیلی طریقۂ حیات پر اب ہمیں حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ ڈرامے کا بادشاہ اگر الفاظ کی سطوت میں کھوجائے تو بلند آہنگ مکالمے اسے ایک لمحے کے لیے ہی سہی اس غلط فہمی تو میں مبتلا کر ہی سکتے ہیں کہ وہ کوئی اور نہیں ایک مطلق العنان بادشاہ ہے۔ کاش کہ ان تمثیلی کرداروں کو اپنی اصل حقیقت کا ادراک ہوتا۔

ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مزاحمت خواہ کتنی ہی باحوصلہ کیوں نہ ہو وہ فتح کی متبادل نہیں ہوسکتی۔ مزاحمت کسی اقدامی عمل کا پہلا زینہ ہوسکتا ہے آخری منزل نہیں۔ زوال کی صدیوں میں جہاں امت نے مزاحمت کی حیرت انگیز داستانیں رقم کی ہیں ہم فی نفسہ اس عمل کو اپنی جدو جہد کا منتہا ومقصود سمجھنے لگے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس سے آگے کا مرحلہ ہمارے منشورِ عمل سے خارج ہو۔ لبنان میں حزب اللہ کی حالیہ مزاحمت، جس سے عالم عرب میں امیدوں کے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں، ہماری ملی تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ استعماری نوآبادیاتی نظام کو الٹ پھینکنے میں مزاحمت ہی ہمارا ہتھیار رہی ہے۔ مزاحمت کے سہارے ہی ہم نے سرخ افواج کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کیا اور یہ مزاحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ عراق میں اب تک دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت کے منصوبے شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے ہیں۔ لیکن ان تمام حوصلہ افزا نتائج کے باوجود ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں تکلف کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ محض مزاحمتی تحریکوں اور مزاحمتی ترکیبوں سے ہماری تنصیب امامت ممکن نہیں۔ افغانستان اور عراق پر امریکی یلغار ہو یا لبنان اور فلسطین پر اسرائیلی جارحیت، ہم اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں کہ ان معرکوں میں دوفریقوں کے مابین طاقت اور نقصانات کے عدم توازن میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ایک طرف جدید خطرناک اسلحوں سے مسلح تربیت یافتہ فوج ہے تو دوسری طرف نہتے سرفروش مزاحمت کار۔ ایک طرف فضا سے مار کرنے والے اسلحوں کی بہتات ہے تو دوسری طرف اس بات کا انتظار کہ دشمن زمینی جنگ کے لئے سامنے آئے تو دودو ہاتھ کرنے کا موقع ملے۔ عملاً زمینی جنگ شروع بھی نہیں ہوتی کہ فی الواقع جنگ کے خاتمے کا اعلان ہوجاتا ہے۔ لبنان میں حزب اللہ کی مزاحمتی تحریک اپنی منتہا پر اگر کچھ کرسکی تو بس

یہی کہ اس نے اپنے عزائم کو مضمحل ہونے سے بچائے رکھا۔ یہ ایک ایسی فتح تھی جس میں مفتوح افواج کو آخری لمحے تک عسکری غلبہ حاصل رہا یہاں تک کہ جنگ بندی بھی ان کی شرائط کے مطابق انجام پائی۔ عزائم اور حوصلوں کو شکست وریخت سے بچالینے کا کام فی نفسہ اپنی جگہ اہم ہے لیکن اسے فتح پر محمول کرنا ہمارے مستقبل کے سلسلے میں تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

اس سوال پر کمالِ سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ صدیوں سے مزاحمتی تحریکوں میں جان دینے والے سرفروشوں کو اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ غاصب قوموں کا ٹیکنالوجی کی مروجہ سطح پر مقابلہ کرسکیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ زبردست افرادی اور مادی وسائل کی فراوانی اور راہِ خدا میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی شدید خواہش کے باوجود مزاحمت کاروں کے حصے میں از کار رفتہ زلزال میزائیلیں آئی ہیں۔ F-16 یا اپاچی ہیلی کاپڑوں تک ان کی رسائی کیوں نہیں ہوسکی ہے؟ وہ دانش گاہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کو اپنا ہدف قرار دیتی ہیں اور جہاں شب وروز ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا درس دیا جاتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ان دانش گاہوں میں نہ تو دفاعی تحقیق کا کوئی شعبہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی فکر مندی کہ F-16 اور B-52 بمبار طیاروں کا ٹیکنالوجی کی سطح پر کیسے مقابلہ کیا جائے۔ گویا آگے کا راستہ صرف مزاحمتی نفسیات سے طے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پچھلی کئی صدیوں میں امت کا مزاج مزاحمتی تحریکوں اور مزاحمتی تحریروں کے ذریعے تشکیل پایا ہے۔ حتی کہ ہمارے علمی ادارے بھی اسی خیال سے قائم کئے گئے ہیں کہ وہ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مکمل اور شافی جواب دے سکیں۔ ایسی صورتِ حال میں آگے کا راستہ بنانے کے لیے ایک نئے دل ودماغ کی تشکیل اولین اور ناگزیر مرحلہ ہوگا۔

ایک فکری دھماکے کی ضرورت

اقوامِ عالم کی سیادت کے دعویداروں کے لیے لازم ہے کہ وہ مدافعت اور مزاحمت کے بجائے توسع اور درگزر سے کام لیں۔ مدعو قوموں کا اپنا حریف سمجھنے کے بجائے اپنا امکانی حلیف سمجھیں اور اپنے تاریخی سفر کا کمالِ احتیاط کے ساتھ کچھ اس طرح جائزہ لیں کہ انہیں تیرہ صدیوں پر مشتمل تاریخی سفر میں در آنے والے فکری التباسات کا بآسانی ادراک ہوسکے۔ ہم پچھلی تیرہ صدیوں میں اپنے مسلسل گرتے گراف کے باوجود اسی روایتی انداز سے چلنے کے عادی رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی صدیوں میں وضاعین وکذابین کے ہاتھوں اور اقوامِ غیر کے تہذیبی اور فکری سرمایوں کے زیر اثر ہماری فکر میں جو التباسات میں در

آئے اور جسے ایک مصنف سے دوسرے مصنف تک نقل درنقل کے ذریعے اعتبار ملتا رہا، اس کے تحلیل وتجزیہ کا واقعی کام انجام نہ پاسکا۔ اس خیال کے ثبوت کے لیے خود روایتی فکر میں اتنا سرمایہ موجود ہے جس سے فاعتبروایااولی الباب کا کام لیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر فہم قرآن میں اسرائیلیات یاعوامی قصوں کاعمل دخل، شانِ نزول کی متضاد تاریخی روایتیں اور روایتوں کی ترتیب وتشکیل میں وضاعین اور کذابین کی کارگزاریاں، ترک دنیا کے بظاہر ایمان انگیز بیانات پرعیسائی رہبانیت کے سائے، جبر وقدر اور الہائیات پر یونانی فلسفہ کے اثرات اور منہاج النبوۃ سے ملوکیت تک کے سفر میں دین اسلام کی ملوکیانہ تشکیل وتعبیر-- یہ وہ التباسات ہیں جن کی واقعی تطہیر کا کام ابھی باقی ہے۔ ابتدائی عہد میں رفع فتنے کے خیال سے منحرف ملوکیت کو جس طرح وقتی طور پر انگیز کرلیا گیا تھا آگے چل کر اس کے مداوے کی کوئی ہمہ گیر کوشش بار آور نہ ہوسکی۔ عمر بن عبدالعزیز کی ناکام کوششوں کے بعد اسی منحرف منہج کو مسلسل انگیز کیا جاتا رہا یہاں تک کہ خلافت کا علامتی دھانچہ بالآخر عثمانی ترکوں کے ہاتھوں اپنے اتمام کو پہنچا۔ اس طویل عرصے میں جو عمر بن عبدالعزیز کے غیاب سے لے کر سلطان عبدالحمید تک کوئی بارہ صدیوں پر مشتمل ہے اسلام کی تعبیر پر سیاسی نظام کا سایہ مسلسل پڑتا رہا ہے۔ شیخ الاسلام کی سرکاری سرپرستی کے بغیر دین مبین کی جوانفرادی تعبیریں سامنے آئیں وہ یا تو سرکاری دائرہ فکر کا توسیعہ رہیں یا پھر گزرتے وقتوں کے ساتھ marginalise ہوکر رہ گئیں۔ تاریخ کے صفحات میں مختلف ائمہ فقہاء کا ظہور اور پھر ان کا اس طرح غائب ہوجانا کہ آج ان کے پیرو کار تو کجا ان کی تصنیفات بھی نہیں ملتیں، دراصل اسی خیال پر دلالت کرتا ہے کہ نظامِ وقت کی سرپرستی کے بغیر ان جلیل القدر فقہاء کا پردہ خفا میں چلے جانا ان کا مقدر تھا۔ اسی طرح احادیث کے کئی مجموعے جن کے نام تاریخ کے صفحات میں ملتے ہیں بوجوہ ہم تک نہیں پہنچ پائے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ جن فقہاء یا ان کے شاگردوں کو نظام وقت کی سرپرستی حاصل رہی یا جن مفکرین کو ان کی زندگی یا موت کے بعد نظام وقت سے کوئی گرویدہ مل گیا، ان کا فکری سلسلہ مستقبل کی تاریخ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ رہے وہ لوگ جو سرکاری تعبیر کے یکسر منکر تھے وہ یا تو زبان بند کرنے پر مجبور ہوئے یا جب ان کی زبان کھلی تو ان سے پر اسرار اقوال منسوب ہوگئے بلکہ بعض فرقوں نے مصائب کی شدت سے تنگ آکر اپنے امام کو ہی غائب قرار دے ڈالا۔ بعض پر خوارج کی پھبتیاں کسی گئیں اور عامۃ الناس کو یہ باور کرایا گیا کہ وہ قرآن مجید کی پرسوز تلاوت تو ضرور کرتے ہیں البتہ قرآن مجید کا ان کے دلوں میں اتر نا ابھی باقی ہے۔ وہ کہتے تو کلمۂ حق ہیں لیکن اس

سے ان کی مراد باطل ہوتی ہے۔ پھر اس خیال کی بھی پرزور وکالت کی گئی کہ مسلمان بنے رہنے کے لیے لازم ہے کہ اہل ایمان بھیڑ کا حصہ بنے رہیں کہ یہی سبیل المؤمنین ہے۔ دین کی تعبیر کو نظام وقت کے شکنجے میں کسنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام وقت کی اصلاح کے بغیر ان تمام اجنبی خیالات اور التباسات فکری سے نجات کے امکانات معدوم ہوگئے جو قتل عثمانؓ سے پیدا ہونے والے شورش زدہ ماحول میں آنے والی صدیوں میں ہمارے ہاں در آتے رہے تھے۔

ایک نئی ابتداء کے لیے اس اجمالی تاریخی بیان کی ضرورت ہم نے اس لیے محسوس کی کہ ہمارا روایتی ذہن جس نے ہمیں مزاحمت کا خوگر بنا رکھا ہے اور جس میں یہ کس بل نہیں کہ وہ اقدامی عمل کا ڈول ڈال سکے،اس کے تانے بانے دوسری صدی کے شورش زدہ ماحول میں پائے جاتے ہیں۔آیئے !اس بات کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی جائے۔

مسلم تصورحیات پر اجنبی سائے

کبھی آپ نے سوچا کہ علوم شرعی جسے روایتی ذہن رأس العلم قرار دیتا ہے خالصتاً قرآنی ثقافت کا پروردہ ہے یا اس کی تعمیر وتشکیل پر اجنبی ثقافت کے سائے مسلسل پڑتے رہے ہیں؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ علوم شرعی کی دانش گاہیں اگر واقعی رأس العلم کی حامل ہیں تو ان دانش گاہوں سے امت کے دفاع کے لیے کسی برتر ٹیکنالوجی کا کوئی نسخہ برآمد کیوں نہیں ہوتا؟ رہے وہ علوم جو فضاؤں پر کمنڈ ڈالتے اور بحر و بر کی پوشیدہ قوتوں کی تسخیر کرتے ہیں تو ہم انہیں غیر شرعی علوم گردانتے اور ان کے حصول کو کمتر درجے کا وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرے میں ''رأس العلم'' کو چھوڑ کر کمتر درجے کے علوم میں اپنی توانائی ضائع کرنے کا رجحان پیدا ہو۔ پھر اس بات پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ یہ 'علوم شرعی' جو فقہائے کے دواوین کا ایک بحر بے کنار ہے، جہاں مفسرین کی لایعنی بحثوں میں مطالب قرآنی گم ہو کر رہ گئے ہیں اور جہاں متضاد روایتوں کی بحث اور راوی کے کذب وصدق پر لامتناہی بحث کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، کیا یہ واقعی مطلوب ومقصود بھی ہیں یا نہیں۔عہد رسولؐ کی ثقافت میں جب فقہاء کے دواوین، رجال کی کتابیں، مفسرین کی موشگافیاں اور متصوفین کے ملفوظات کا کوئی دفتر مرتب نہیں ہوا تھا قرآن مجید کی سیدھی سادی تلاوت ہر ذہنی سطح کے اہل ایمان کو راہ یابی کی ضمانت دیتی تھی۔ اس نغمۂ خداوندی میں راہ یاب قوموں کے والہانہ تذکرے اور گمراہ قوموں کے عبرتناک انجام سے مخاطب کے دل پر صرف ہیبت ہی

طاری نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے اسرار رموز کے بیانات پڑھ کر اسے اپنی قدر و منزلت اور اپنے مفوضہ رول کا صحیح ادراک ہوتا۔ قرآن ایک ایسے دین کا داعی تھا جہاں والہانہ سپردگی پر اصرار تھا۔ یہاں رسوم عبودیت کو اصر واغلال قرار دیا گیا تھا پھر بھلا اس بات کی گنجائش کہاں تھی کہ رموزِ زندگی اور امور عبودیت کے ایک ایک رکن پر فرض، واجب، نفل، سنت، مباح اور مستحب کی بحث چل نکلے۔ قرآن نے ایک نئے ذہن کی بنا ڈالی تھی۔ اس نئی ابتداء میں انسانوں کو غور وفکر، تدبر وتفکر اور انفس وآفاق کی تسخیر کا کام انجام دینا تھا۔ بندوں میں یہ ممتاز گروہ جو نظام کائنات میں اپنی بصیرت کے سبب تقویٰ شعاری میں سبقت لے جانے والوں پر مشتمل تھا انہیں اہل علم یا علماء کہا گیا۔ یہ تھا وہ قرآنی دائرہ فکر اور یہ تھا مستقبل کا وہ ذہنی انقلاب جس کا قرآن داعی تھا۔ آنے والے دنوں میں اگر یہ قرآنی دائرۂ فکر پوری طرح برقرار رہتا تو امت میں ایجادات واکتشافات کو مذہبی وظیفے کے طور پر انجام دینے کی ریت تشکیل پاتی۔ غیر قرآنی اقوام کے مقابلے میں جو نظامِ کائنات کی سرّیت کے ادراک سے عاجز تھے، جو توہمات کے زیر اثر فطرت کی پرستش کو اپنا فریضہ منصبی خیال کرتے تھے، حاملین قرآن اس بات کے کہیں زیادہ اہل تھے کہ وہ کائنات کو، جیسی کہ وہ ہے، اس کی اصل ماہیئت کے ساتھ مطالعے کا موضوع بنائیں۔ لیکن افسوس کہ اس قرآنی دائرہ فکر پر اجنبی افکار ونظریات کی یورش نے مسلمانوں کو اس فطری اور منطقی فریضۂ منصبی سے یکسر دور کر دیا۔

فکر ونظر میں یہ غیر معمولی تبدیلی، جس نے آنے والے دنوں میں امت کی گویا سمت ہی بدل کر رکھ دی، بنیادی طور پر تصور حیات کی تبدیلی تھی۔ آنے والے دنوں میں جب اس تصور حیات کے نتائج فکری اور نظری سطح پر کہیں زیادہ منقح ہو گئے، اس کے سدباب کی کوئی کوشش اس لیے کارگر نہ ہو سکی کہ پچھلی صدیوں کو ثم الذین یلونھم کے زیر اثر تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا تھا جس پر سوالیہ نشان لگانا مستقبل کے علماء ومفکرین کے لیے ممکن نہ رہا۔ فکر ونظر میں یہ تبدیلی کیسے در آئی؟ مسلمان تدبر وتفکر اور تعقل کی راہ سے تقلید اور اسلاف پرستی میں کیسے مبتلا ہوئے؟ یہ ایک ایسی دل گرفتہ داستان ہے جس کے تفصیلی محاکے کے بغیر مروجہ اور منحرفہ مسلم تصورِ حیات کو دوبارہ اپنی اصل پر لوٹانا ممکن نہیں۔

یہ سب کچھ ہوا کیسے، یہ وہ کلیدی اور حساس سوال ہے جس پر سنجیدہ غور وفکر اور علمی تحلیل وتجزیہ کی ریت قائم ہونا ابھی باقی ہے۔ بارہ صدیوں کے التباساتِ فکری کی بنیادیں جن ایام میں پائی جاتی ہوں اگر انہیں مقدس قرار دے کر ان کے بارے میں کسی صحت مند تنقیدی گفتگو کا دروازہ بند کر دیا جائے تو ہمارے

لیے اپنے فکری زوال کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ممکن نہ ہوگا۔ بھلا اس خیال سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قتل عثمانؓ اور خلافت راشدہ کے سقوط کے بعد ریاست کے مرکزی ڈھانچے میں جو کمزوری آگئی تھی اور جس کے سبب مختلف خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے والوں میں جابجا ایسے عالم نما، قصاص راویوں اور حفاظ کا ظہور ہورہا تھا جو ہر قسم کے رطب ویابس کو عہد رسولؐ کے حوالے سے مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسلامی ریاست میں خود اس کے اندرون سے اس فکری حملے کی سنگینی قبائلی بغاوتوں سے کہیں زیادہ تھی جس کے مداوا کے لیے عمر بن عبدالعزیز کو یہ خیال آیا کاش صحیح ترین اقوال وآثار کو کوئی مدون کردیتا تاکہ تاریخ وآثار کے نام پر رطب ویابس کی ترویج واشاعت کا سلسلہ رک جاتا۔ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت اس عظیم فکری پروجیکٹ کی متحمل نہ ہوسکی۔ آنے والے دنوں میں روایتوں کی تصحیح وتنقید کا کام انفرادی طور پر ہی انجام پاتا رہا۔ افراتفری کے اس ماحول میں وہ لوگ بھی سرگرم رہے جو منسوب الی الرسول اقوال کے حوالے سے امت میں افتراقِ فکری اور التباساتِ نظری کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ گویا ہم جس عہد کو سلفِ صالحین کے عہد سے موسوم کرتے ہیں وہاں سلفِ طالحین کی کثرت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ تو مسئلہ کا صرف ایک رخ ہے جس پر ہمارے ہاں خاصی بحث تمحیص ہوتی رہی ہے البتہ اصل مسئلہ جس پر میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اور جو میرے نزدیک ہمارے تصورحیات میں بنیادی تبدیلی کی وجہ رہی ہے، وہ مسلم فکر کی ابتداء وارتقاء سے متعلق ہے۔

علم کو شرعی اور غیر شرعی کے خانوں میں تقسیم کرنے اور خود ساختہ اصحاب علومِ شریعت کے پیشوائیت کے منصب پر فائز ہوجانے سے نہ صرف یہ کہ اسلام کی ایک مرسوم تعبیر سامنے آئی بلکہ آنے والے دنوں میں علم کے سلسلے میں مسلمانوں کا تصور یکسر تبدیل ہوتا گیا۔ مفروضہ علم شرعی جس کی اساس وحی ربانی میں بتائی جاتی تھی اور جسے اہل ایمان کی فلاح ونجات کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا اب چونکہ رأس العلم قرار پایا اس لیے غیر شرعی علوم کے سلسلے میں اہل ایمان کے دلوں میں تحقیر وبے اعتنائی پیدا ہوئی۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کیسے ہوگیا اس کی بہتر تفہیم کے لیے لازم ہے کہ ہماری نگاہیں اس عہد کے ساجی منظرنامے کو کسی حد تک مستحضر کرسکیں جہاں فکرونظر کی یہ تبدیلی وقوع پذیر تھی۔ تاریخ اور روایت کی کتابوں میں اس نامحسوس عمل کی تفہیم کے لیے خاصا مواد موجود ہے۔

اسلام کی حیثیت گوکہ ایک آفاقی دین کی ہے جسے تاریخ کے آخری پیغمبرؐ کے ہاتھوں آخری ساعت

تک کے لیے نازل کیا گیا ہے البتہ اس کی ابتداء ایک بدوی معاشرے سے ہوئی تھی۔ پہلی نسل کے مسلمان اس حقیقت سے آشنا تھے کہ قبائلی نظام اور مروجہ سیاسی وسماجی ادارے ایک آفاقی دین کی تنصیب کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ لہٰذا پہلی نسل کے مسلمانوں نے نئے نظامِ انصاف کے قیام کے لیے نئے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کی تشکیل کی کوشش کی۔ انہیں جو چیز قرین انصاف دکھائی دی اسے انہوں نے بلاتکلف اختیار کیا۔ حتیٰ کہ اس عمل میں انہیں اپنے بعض سابقہ اقدام کی نفی کرنا پڑی تو وہ اس سے بھی نہ ہچکچائے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں عہد رسولؐ کے بعض فیصلوں میں ترمیم و تنسیخ یا خود اپنے ہی بعض سابقہ فیصلوں کے بارے میں یہ کہنا کہ تب ہم ایسا کرتے تھے اور اب ہم ایسا کرنا زیادہ قرینِ انصاف سمجھتے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی نسل کے مسلمان کسی عہد کو محض عہد رسول سے قربت کی وجہ سے تقدس کا حامل نہیں سمجھتے تھے۔ ایک خلیفہ کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنے پیش رو سے بدلی ہوئی صورتِ حال میں، بلاتکلف اختلاف کرے اور اپنے نئے اقدام کو موجودہ نئی صورتِ حال میں انصاف سے کہیں زیادہ قریب بتائے۔ حضرت عمرؓ نے جب تالیف قلب کے سلسلے میں نص کی موجودگی کے باوجود اپنے پیش رو قائدین سے الگ راہ اختیار کی یا جب آپ نے قطع ید کی قرآنی حد کو مخصوص حالات کے تحت معطل کرنا مناسب سمجھا یا جب مفتوحہ آراضی کے سلسلے میں آپ نے رسول اللہ کی قائم کردہ نظیر سے مختلف موقف اختیار کیا تو وہ اس ایقان کے حامل تھے کہ تقدیس کسی عہد یا کسی فیصلے کو نہیں بلکہ اس غایت انصاف کو ہے جس کے قیام کے لیے خدا نے محمدؐ رسول اللہ پر اپنی کتاب نازل کی۔ اخذ واکتساب کی اس صحت مندروایت نے جزیرۃ العرب کے اس مختصر سے گروہ کو جسے قیادت وسیادت کا کوئی تجربہ نہ تھا، دنیا کے ایک بڑے خطے کے انتظامات کا اہل بنادیا۔ رومی اور ایرانی حکومتوں کے پاس انتظام وانصرام کا جو تجربہ تھا ان سے اخذ واستفادے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ کسی چیز کو یہ کہہ کر رد کرنا کہ اس کی بنیادیں اجنبی تہذیب میں پائی جاتی ہیں ابتدائی مسلمانوں کا شعار نہ تھا۔ حکمت مومن کی متاع گم شدہ سمجھی جاتی۔ سو وہ جہاں بھی مل جائے اس سے اخذ واکتساب کو مسلمان اپنا حق سمجھتے۔ ذرا غور کیجیے عہد رسولؐ کی وہ جنگ جس کے نتائج پر بڑی حد تک امت مسلمہ کا مستقبل منحصر تھا وہاں خندق کا کھودا جانا خالصتاً فارسی تجربے کی پیداوار تھا۔ لیکن اس مشورے کو اختیار کرنے میں آپؐ نے کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انتظامی تجربوں اور مروجہ ٹیکنالوجی کے حصول کی حد تک تو یہ اخذ واستفادے صحت مند رویے کا اظہار تھے جس کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ البتہ اخذ واستفادے کی اس سماجی فضا میں جہاں

عیسائی اور یہودی علماء بھی داخل اسلام ہورہے تھے اور جو اپنے ساتھ علمی مطالعات کا سابقہ منہج بھی لے آئے تھے ان کے تعامل کا اثر بھی فطری تھا۔ دیکھا جائے تو بات یہیں سے خراب ہوئی۔

پہلی صدی ہجری کے خاتمے تک ایسے لوگوں کی وافر تعداد ریاست کے مختلف علاقوں میں منظر عام پر آچکی تھی جو عہد رسولؐ کے بیانات اور ان ایام کے ایمان افروز تذکروں سے عوام الناس میں قصاص، راوی اور واعظ کی حیثیت سے متعارف ہورہے تھے۔ جوں جوں عہد رسولؐ زمانی طور پر دور ہوتا جاتا تھا آثار وایام کے ان بیانات کی سماجی، جذباتی اور علمی حیثیت بڑھتی جاتی تھی۔ پھر ان بیانات کی محض واعظانہ حیثیت نہ تھی بلکہ ان کی روشنی میں اجتماعی اور انفرادی مسائل کے حل کی کوشش کی جاتی۔ دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک آثار ونظائر سے باضابطہ مسائل کے استخراج کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے ان واعظین کی باضابطہ مجلسیں قائم ہوگئیں اور ایسا فطری بھی تھا کہ مسلمان ذات ختمی رسالت سے جذباتی وابستگی کے سبب ایام وآثار کے ہر بیان میں حظِ ایمان کا سامان پاتے۔ عہد رسول کے ان تاریخی بیانات کی تحفیظ کے ساتھ ہی اس داعیہ کا پیدا ہونا بھی فطری تھا کہ ان بیانات سے ہم اپنی زندگیوں کو کس طرح تابدار بنائیں۔ ابتداء میں آثار وروایات کا علم، قصوں اور شانِ نزول کے ذریعے قرآنی تاویلات کے مناہج اور ان آثار سے مسائل کے استخراج کی کوشش یہ سب کچھ ایک ملاجلا عمل تھا کہ اس وقت تک فقہاء مفسرین اور محدثین کی الگ الگ شناخت قائم نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ مذہب کے حوالے سے اہل علم کے ایک طبقے نے عام مسلمانوں سے الگ اپنی شناخت واضح کرلی تھی۔ البتہ دوسری صدی کے خاتمے تک محمد بن ادریس شافعی کی پہلی باضابطہ مدونہ علمی کوششوں کے سبب حاملینِ علوم دین کی واضح شکل وصورت سامنے آگئی۔ شہاب زہری جو پہلی صدی کے خاتمے پر روایتوں کے سب سے بڑے جامع کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں ان کا تذکرہ بھی تاریخ کی کتابوں میں محض آثار رسولؐ کے عالم کی حیثیت سے ملتا ہے۔ عہد رسول کے سیدھے سادے ایمان افروز تذکرے کو باقاعدہ علم شرعی اور رأس العلم بننے میں مزید کوئی سوسال کا عرصہ لگا۔ الرسالہ کی تصنیف گویا اس بات کا اعلان تھی کہ اب مسلمانوں میں بھی ایک طبقۂ احبار یا مذہبی پیشوائیت متشکل ہوچکی ہے۔ یہ نئی پیشوائیت جسے دوسری صدی کے خاتمے تک ایک واضح شکل مل چکی تھی احبارِ اسلام کی شکل اختیار نہ کرتی اگر اس نے علوم کو شرعی اور غیرشرعی کے خانوں میں تقسیم نہ کیا ہوتا۔ آثار وایام کے علماء تو پہلے بھی موجود تھے جن کی معلومات سے پہلی نسل کے مسلمان بھی

استفادہ کرنا مناسب خیال کرتے تھے۔ خلفائے راشدین کی مشاورتوں میں اس عمل کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔ بعد کے عہد میں معاملات قضاء میں ان سے استفادے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ البتہ یہ خیال کہ یہ حضرات حاملین علوم نبوت ہیں، ان کا علم علمِ شرعی ہے اور یہ وارثین انبیاء ہیں، یہ وہ خیالات ہیں جن کی بازگشت کم از کم ابتدائی دوصدیوں کے دوران سنائی نہیں دیتی۔ مسلمانوں میں جب یونانی علوم کے زیر اثر کلامی بحثوں کا سلسلہ چل نکلا اور جب اس صورتِ حال نے ایک دانشورانہ انارکی کی کیفیت پیدا کردی تب پہلی بار یہ سوال ہمارے لیے اہمیت اختیار کرگیا کہ کون سے علوم واقعتاً مفید ہیں اور کن علوم کو لائق استراد سمجھنا چاہیے۔ شرعی اور غیرشرعی علوم کی تقسیم نے اگر ایک طرف معقولات کے سیلاب کو روکنے میں مدددی تو دوسری طرف آگے چل کر اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بہت سے مفید علوم، علومِ شرعی کی تعریف سے باہر رہ گئے۔ علوم شرعی کا محدود تصور جس سے خود قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ باہر رہ گیا تھا اور جس کا انفس وآفاق میں غور فکر کی دعوت دینے والی تمام آیات احاطہ نہیں کرتی تھیں مسلم ذہن کو بہت جلد ایک ایسی بند گلی میں لے گیا جہاں سے اس کا نکلنا آج بارہ صدیوں کے بعد بھی ممکن نہیں ہوسکا ہے۔

دیکھا جائے تو ابتدائی صدیوں میں علوم کا ارتقاء کسی واقعی منصوبہ بندی سے خالی رہا۔ اس دانشورانہ انارکی کا ایک سبب تو یہ تھا کہ فتنۂ قتل عثمان کے بعد مرکزی حکومت کی گرفت خاصی کمزور ہوچکی تھی۔ آنے والے دنوں میں جب خلفاء کی جگہ موروثی ملوکیت نے لے لی، ریاست کی پہلی ترجیح اسلام کے بجائے اپنے اقتدار کی بقا واستحکام بن گئی اور چونکہ اس موروثی نظام کے استحقاق کے لیے براہِ راست دلیل لانا مشکل تھا اس لیے ان اصحابِ فضیلت اور حفاظ حدیث کی بن آئی جو فتنہ کے خوف سے سلطان جائر کی اطاعت کو لازم قرار دیتے تھے۔ نظامِ وقت کی مخالفت اور موافقت میں وضعی حدیثوں کی کثرت اسی بات پر دال ہے کہ جو نظام خود ان وضعی حدیثوں کے سہارے اپنے جواز اور استحقاق پر دلیل لاتا ہو بھلا اس کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ان اصحاب علم وفضیلت کے علمی فتنوں کا قلع قمع کرتا۔ احادیث کی کتابوں میں جہاں اموی حکمرانوں کی سمندری فتوحات کی تقدیس میں روایتیں موجود ہیں وہیں ایسی روایتوں کی بھی کمی نہیں جو بعض عباسی خلفاء کو نام بنام سند جواز فراہم کرتی ہیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں جب مکہ اور اس کے اطراف پر عبداللہ بن زبیر کے قبضے کی وجہ سے شامی مسلمانوں کے لیے حج کی خاطر وہاں جانا سیاسی اعتبار سے نامناسب سمجھا گیا تو یروشلم میں ایک متبادل زیارت گاہ کے لیے شہاب زہری کے حوالے سے ایک ایسی

روایت سامنے لے آئی گئی جو مذہبی اعتبار سے عبد الملک کے نوتعمیر قبّہ کو حرمِ مکی کا مقابل قرار دیتی تھی۔ گویا حفاظ حدیث کے سماجی وقار اور بڑھتے اثر ورسوخ سے نظام وقت مسلسل فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دوسری طرف کچھ تو اس سرکاری سرپرستی کے زیر اثر اور کچھ عہد رسول کے ایام وآثار سے عام مسلمانوں کی جذباتی وابستگی کے سبب ان علوم کے حاملین کے لیے عام ذہنوں میں قدر ومنزلت کا پیدا ہونا فطری تھا۔

دوسری صدی کے وسط تک حفاظ حدیث کے سماجی اثر کا یہ عالم ہوگیا کہ ان کی مجلسوں کا وقار مقامی حکمرانوں سے بھی بڑھ گیا۔ یہ حضرات جب ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے تو ان کے استقبال کے لیے ایک خلقت اُمڈی آتی۔ عوامی تائید واحترام کے یہ غیر معمولی مظاہر وقت کے حکمرانوں کو بھی نصیب نہ تھے۔ اصحاب فضیلت کی اس غیر معمولی پذیرائی نے ان علوم کے حصول کے لیے ایک عمومی لہر کی سی کیفیت پیدا کردی تھی۔ تیسری صدی کی ابتداء تک اصحاب علم کے مابین علمی فتوحات کا معیار یہ ہوگیا کہ کس کے پاس کتنی روایتیں ہیں اور ان روایتوں میں بھی کس کے پاس کتنی ثلاثی ہے اور کتنی رباعی۔ یعنی تین راویوں سے آنے والی حدیثوں کی تعداد کتنی ہے اور چار راویوں والی کتنی، کہ علم کی دنیا میں قدوقامت کے تعین کا معیار اب یہی رہ گیا تھا۔ آگے چل کر جب تفسیر، فقہ اور روایتوں کے علوم الگ الگ شکل میں مرتب ہونے لگے اور جب رجال کی جرح وتعدیل کالامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو ان علمی معرکوں میں یہ چیز باعثِ فخر سمجھی جانے لگی کہ کس کے پاس رطب یابس کا ذخیرہ کتنا زیادہ ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ بسم اللہ کی تشریح وتعبیر میں دفتر کے دفتر لکھ سکتا ہے تو کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ صرف بسملہ کے نقطۂ ب پر اتنا کچھ لکھ سکتا ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے سات اونٹوں کی ضرورت پیش آئے۔ تفسیر ہو یا تاریخ، فقہاء کے دواوین ہوں یا روایات کے مجموعے ان سبھوں کی ترتیب وتالیف میں کیفیت کے بجائے کمیت پر کہیں زیادہ زور رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں متضاد روایتوں کی بھرمار اور تفسیری حواشی میں بے سروپا داستانوں کی موجودگی اسی بات پر دال ہے کہ اس عہد میں علمی جاہ وحشم کا تعین اس بات سے ہوتا تھا کہ کس نے کتنی مجلدات تصنیف کرڈالی ہیں۔ طبری جو ہمارا پہلا باقاعدہ مورخ ہے، اور جس کی داستان پسندی نے مسلمان ذہن پر گہرے اثرات ڈالے ہیں، اس کی تیس جلدوں پر مشتمل تفسیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس تفسیر کا خلاصہ ہے جو بالاصل تین سو جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ اسی طرح صحیح بخاری جس میں کوئی چار ہزار روایتوں کا اندارج ہے، کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چھ لاکھ روایتوں کے نقد وتجزیے کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ اسی طرح ابو

ذرعہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں سات لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں ۔ ایک ایسے عہد میں جہاں علمی وجاہت کا پیمانہ معیار کے بجائے مقدار بن گیا ہو اس طرح کے دعاوی نا قابل فہم نہیں۔ آج ہماری دسترس میں نہ تو طبری کے تین سو تفسیری مجلدات ہیں اور نہ ہی ابوذرعہ کی سات لاکھ حدیثیں، اس لیے ہمارے لیے ان اقوال کی واقعی تصدیق کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ خیال کہ اہل علم کے مابین مجلدات کی ضخامت اور کثرت پر فخر ایک مستحکم روایت بن گئی تھی، اس بات کے ثبوت کے لیے ہمارے ثقافتی ورثے پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ سیوطی جو نویں صدی کے مصنف ہیں اور جن کی تصنیف 'الاتقان' کو اپنی تمام تر التباسات فکری کے باوجود علوم القرآن پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے وہ بھی اس بات کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں کہ اس موضوع پر پائی جانے والی تمام تر معلومات کا عرق اس کتاب میں کشید کرلیا گیا ہے۔ قدماء کی کتابوں کو نئی تالیفات میں ہضم کر لینے یا اس کے عرق کو پوری طرح کشید کر لینے کا رجحان جب ذرا تھما تو قدیم تصنیفات پر حاشیہ در حاشیہ لکھنے اور ان کی مشکل اور ثقیل تلخیصات کی طرف توجہ ہوئی۔ گویا قدماء نے جو معلومات جمع کی تھیں اسے ان علوم کا منتہا ومقصود سمجھ لیا گیا۔ ان کے تحلیل وتجزیے اور تنقیدی مطالعے کی کوئی صحت مند روایت قائم نہ ہوسکی۔ رہا وحی ربانی کا راست مطالعہ تو اس بارے میں یہ خیال عام ہوا کہ قدماء غور وفکر کا سارا کام انجام دے چکے اور یہ کہ اب ذہن اس لائق نہیں رہے جو ان بظاہر مرعوب کن مجلدات پر اضافہ کرسکیں۔

مسلمانوں میں علوم کے ارتقاء کا یہ سلسلہ، جو عہد فتنہ کے زیر اثر دانشورانہ انارکی سے شروع ہوا اور جو عہد بعہد مختلف علوم اسلامیہ کی شکلوں میں منتج ہو کر ہم تک پہنچا ہے، کے بارے میں درج ذیل باتیں وثوق سے کہی جاسکتی ہیں:

۱-موجودہ علوم اسلامیہ جنہیں ہم آج تفسیر وتاویل، جرح وتعدیل، روایت ودرایت، اصول الفقہ، منطق وفلسفہ اور عروض وبلاغت سے موسوم کرتے ہیں یہ علوم اپنی موجودہ شکلوں میں عہد رسول میں نہیں پائے جاتے تھے۔

۲-قتل عثمانؓ سے پیدا ہونے والے سیاسی بحران نے جہاں قصاص اور واعظین کے لیے اس بات کے امکانات پیدا کردیے کہ وہ اپنے دلچسپ بیانات اور رنگ آمیز وقائع نگاری کے ذریعہ تعبیری پراگندگی پیدا کریں وہیں نظامِ وقت پر موروثی ملوکیت کے قبضے نے خالص قرآنی دائرہ فکر میں کسی واقعی علمی تحریک

کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ افراتفری کے اس ماحول میں جو لوگ ایام و آثار کے حوالے سے سماجی منظر نامے پر طلوع ہو رہے تھے اور جن میں صادقین وصالحین کے ساتھ ساتھ وضاعین و کذابین کی بھی خاصی بڑی تعداد شامل ہوگئی تھی، ان کے سماجی دبدبہ اور مذہبی اثرات پر روک لگانا یا اسے قابو میں رکھنا ممکن نہ رہا۔

۳- قرّاء کے مقابلے میں حفاظ حدیث کی بڑھتی سماجی مقبولیت اور اس فن کا رأس العلم کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جانا، حتیٰ کہ آنے والے دنوں میں اس کے بطن سے نکلنے والے علوم کو علوم شرعی قرار دینا، محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر تھا۔

۴- روایتوں کو فقہی ابواب کے تحت مرتب کرنا جیسا کہ امام بخاری نے کیا، یا آثار وایام کی روشنی میں احکام برآمد کرنے کی کوشش، جس کا ایک اظہار مؤطا امام مالک ہے، یا کتاب وسنت کی روشنی میں دانش انسانی کے استعمال سے ممکنہ مسائل پر اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ، جس کی طرح ابوحنیفہ نے ڈالی، یا کتاب و سنت کی روشنی میں احکام وضع کرنے کے علمی اصول جسے شافعی نے وقیع انداز سے مرتب کرنے کی کوشش کی، یہ سب کی سب بنیادی طور پر ان جلیل القدر علماء کی انفرادی کاوشیں تھیں۔ ایسا کرنے کے لئے نہ تو وہ منجانب اللہ مامور تھے اور نہ ہی ان انفرادی کوششوں کو دین اسلام کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن محدثین اور فقہائے عظام کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اپنے عہد میں صرف یہی حضرات ان علمی سرگرمیوں میں مصروف نہ تھے۔ روایتوں کے نہ جانے کتنے مجموعے اور فقہا کے نہ جانے کتنے دبستان تاریخ کے صفحات میں گم ہوگئے۔ لیکن ان کے غیاب سے ہم دین اسلام میں کسی تشنگی کا احساس نہیں پاتے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی عہد کی وہ کتابیں جو ہم تک پہنچی ہیں ہمارے لئے فہمِ دین کا ناگزیر حوالہ قرار پائیں۔ اہل علم کے ان انفرادی پروجیکٹ کو اپنی تمام تر جلالت علمی کے باوجود، ان حضرات کی مستحسن انفرادی کاوشوں کی حیثیت سے دیکھا جانا چاہئے اور بس۔

۵- ائمہ اربعہ کا canonization، جسے شاہ ولی اللہ جیسے حضرات بھی من جانب اللہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں، محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر ہے۔ ملک الظاہر شاہ بے برس نے اگر مذہبی خانہ جنگیوں سے تنگ آکر بیک وقت ان چار مسالک کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا ہوتا تو آگے چل کر نہ تو حرم مکی میں چار علیحدہ مصلّوں کا قیام عمل میں آتا اور نہ ہی سنی مسلم فکر ائمہ اربعہ کو تقدیس کا حامل سمجھتی۔ جس طرح

سفیان ثوری اور امام اوزاعی جیسے جلیل القدر فقہاء اپنی زبردست سماجی مقبولیت کے باوجود اپنے عہد میں رشد و ہدایت کا کام انجام دینے کے بعد تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہوگئے اسی طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی دبستان بھی تاریخ کی زینت بن جاتے۔ لیکن شاہ بے برس کے ایک قدم نے، جو دراصل رفع فتنہ کی خاطر اٹھایا گیا تھا، جو ایک شخص کا انفرادی فیصلہ تھا اور جس کی حیثیت محض ایک اتفاقی اور حادثاتی امر کی ہے، آنے والے دنوں میں ائمہ اربعہ کے تصور کو مسلم فکر میں کچھ اس طرح راسخ کردیا کہ اب عام انسانوں کے لئے ان کے بغیر دینی زندگی کا تصور محال نظر آتا ہے۔

۶-علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم اصحاب فن کا انفرادی فیصلہ تھا جس کے لئے وحی ربّانی سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ علوم جو شرعی قرار دئے گئے قرآن مجید کی روشنی میں ان کا شرعی ہونا بھی محل نظر ہے۔ کسی مخصوص عہد کے اصحاب فن کے التباس فکری کو مستقبل کی تمام نسلوں کے لئے سدّ راہ اور حجت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۷-شرعی علوم کے اس محدود تصور نے مسلمانوں میں سماجی، سائنسی اور اکتشافی علوم کا راستہ روکنے میں بنیادی رول ادا کیا۔ حتیٰ کہ جو لوگ عباسی بغداد میں تحقیقی اور اکتشافی سرگرمیوں میں مصروف رہے وہ اجنبی ثقافت کے پروردہ سمجھے گئے اور وہ خود بھی اس کسک کے ساتھ جیتے رہے کہ حاملین علوم شریعت کے مقابلے میں انہوں نے ایک کم تر درجے کا وظیفہ اختیار کر رکھا ہے۔ علوم شرعی کے حاملین چونکہ خود کو وارثین نبوت بتاتے، انہیں فکر اسلامی کا معتبر شارح اور ترجمان سمجھا جاتا، اس لئے کسی کو اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مفروضے کو وحی اور عقل کی روشنی میں چیلنج کرتا۔

۸-قرآن مجید کو فقہی، شرعی یا مولویانہ انداز سے پڑھنے والوں نے کوئی پانچ سو آیات کو آیاتِ احکام کی حیثیت سے اپنے غور وفکر کا مستحق سمجھا تھا۔ اس طرف لوگوں کی توجہ کم ہی گئی کہ یہ علوم جو بنیادی طور پر ان پانچ سو آیات کو اپنی توجہ کا مستحق سمجھتے تھے، اس نے وحی ربانی کے ایک بہت بڑے حصے کو عملی طور پر علوم شرعی کے دائرے سے باہر کر رکھا تھا۔ آیات اللہ فی الکون کے مطالعے اور مشاہدے کا علوم شرعی کے دائرے سے باہر ہوجانا ایک بحرانی عہد کی اجتہادی اور تعبیری لغزش تھی۔ جس نے آنے والی صدیوں میں امت کو تحقیق واکتشاف کے عمل سے دور کردیا۔ آیت احکام کے علاوہ قرآن مجید کے ایک بڑے حصے کو عملی طور پر منجمد کئے جانے کے نتیجے میں آج ہم من حیث الامۃ منصب سیادت سے معزول ہوگئے ہیں۔

یہ وہ چند بنیادی حقائق ہیں جن کی بنیادیں تو ایک مخصوص عہد کے انفرادی التباسات میں پائی جاتی ہیں لیکن ایک زمانے کی مہرثبت ہوجانے کی وجہ سے گزرتے وقتوں کے ساتھ اسے امت کا اجتماعی فیصلہ اور راسخ العقیدہ فکر کا اظہار سمجھا جانے لگا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان انفرادی لغزشوں کے سبب، جو کبھی بعض اہل علم سے صادر ہوئیں اور کبھی سیاسی عوامل اس کی پشت پر رہے، بالکل ابتدائی ایام میں ایسے اسباب وعوامل پیدا ہوگئے کہ قرآنی دائرہ فکر میں ایک واقعی علمی اور اکتشافی تحریک کا خاکہ دھندلا ہوکر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وحی ربانی کی روشنی میں الٰہیات، عمرانی اور اکتشافی علوم کا ارتقاء اس انداز سے نہ ہوسکا جس کا قرآن داعی تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں رجوع الی القرآن کی تحریکیں قرآنی دائرہ فکر کو ازسرنو مہمیز کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ لیکن عملاً ہوا یہ ہے کہ راسخ العقیدگی کے دباؤ، جس کی پشت پناہی بوجوہ نظامِ وقت کرنے پر مجبور تھا، کی وجہ سے نئے مفکرین کو پرانی فکر کا توسیعہ بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ زوال کی صدیوں میں جہاں اجتہاد جیسے صحت مند رویے سے بھی لوگ خوف کھاتے تھے ایسا سمجھا جاتا تھا کہ کسی نئی بحث کا دروازہ کھولنا، یا امت کے قدیم فکری ڈھانچے پر ضرب لگانا، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے منافی ہوگا۔ ماضی کے مقابلے میں آج عام انسانوں کے لئے قرآن مجید کا آزادفضا میں پڑھنا کہیں زیادہ ممکن ہے۔ آج جب شیخ الاسلام کا سرکاری اسلام عام انسانوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ وحی ربانی کے صفحات میں صرف سرکاری تعبیرات کو پڑھیں، ہمارے لئے ماضی کے مقابلے میں رجوع الی القرآن کا عمل نسبتاً کہیں آسان ہے۔ کل تک شیخ الاسلام کے لئے ممکن تھا کہ وہ عثمانی خلافت میں اکتشافی علوم کے لئے قائم کی جانے والی درس گاہ دارالفنون کو صرف اس لئے بند کروادے کہ اکتشافی علوم، اس کے خیال میں، شرعی علوم سے باہر کی چیز تھی۔ لیکن آج مسلم فکر کے التباسات کی پشت پر وہ سیاسی قوت معدوم ہوچکی ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں راسخ العقیدگی کا بے لاگ محاکمہ کرنے میں بوجوہ مزاحم ہوتی رہی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان انفرادی التباسات فکری، جس کے سبب مسلمانوں میں علوم کا ارتقاء یک رخا اور کارِ بے بنیاد بن کر رہ گیا ہے، ان کا نہ صرف یہ کہ بے لاگ محاکمہ کیا جائے بلکہ بالکل نئے خطوط پر ازسرِ نو قرآنی تصورِ حیات کے مطابق ایک نئی علمی تحریک کی داغ بیل ڈالی جائے۔ قرآن مجید جہاں بندے سے خدا کا رشتہ استوار کرتا ہے وہیں وہ بندوں کو تدبر وتفکر اور مشاہدۂ کائنات کی دعوت بھی دیتا ہے۔ فرد کا کائنات اور اس کے خالق سے یہ رشتہ ایک حساس اور نازک توازن کا داعی ہے۔ لازم ہے

کہ ہم پوری کتاب کو اپنی ہدایت کا مرکز ومحور بنائیں۔ اس کے برعکس محض چند آیات کو آیاتِ احکام قرار دینا یا اسے شرعی امور کا حامل بتانا افتؤ منون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کی صورت حال پر منتج ہوگا جس کے تباہ کن نتائج کا ہم ماضی میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر قرآن مجید کو از سر نو راست مطالعے کا موضوع بنایا جاسکا اور ہمارے لئے یہ ممکن ہوسکا کہ ہم پچھلی بارہ صدیوں کے التباسات فکری پر خط تنسیخ پھیر سکیں تو قرآنی دائرۂ فکر میں ایک تازہ بہ تازہ علمی تحریک ہمیں دوبارہ منصب سیادت پر فائز کرسکتی ہے۔ یہ وہ فکری دھماکہ ہے جس کے لئے امت کے بہترین دماغ کوئی بارہ صدیوں سے منتظر ہیں۔



دنیا کے وہ بیس ممالک جن کے پاس تیل کے ذخائر کا ٪۹۵ حصہ ہے ان میں بارہ مسلم ممالک شامل ہیں جن کے پاس مجموعی طور پر تیل کا ٪۶۸ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ یہی حال قدرتی گیس کا ہے جس کے نصف سے زائد زخائر مسلم علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ امت مسلمہ جو اس وقت ۵۷ چھوٹے بڑے ملکوں کا مجموعہ ہے نہ صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے اہم علاقوں میں واقع ہے بلکہ خود مغربی تہذیب کے عین قلب میں اب مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی وجود میں آگئی ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ ہم مسلمان صرف تیل اور دوسرے فطری وسائل سے مالا مال نہیں بلکہ خدا کی آخری اور غیر محرف کتاب بھی ہمارے ہی درمیان موجود ہے۔ جزیرۃ العرب میں تیل کی یہ دولت ایک بڑی خدائی اسکیم کا حصہ ہے۔

۱۴

تہذیب کی تشکیل جدید

ہم جس تہذیب میں سانس لے رہے ہیں وہ اپنے کمال عروج کے بعد زوال کی طرف گامزن ہے۔مغرب کی یہ تہذیب جس نے فی زمانہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے بنیادی طور پر انجن اور ایندھن کی رہین مِنّت ہے۔صنعتی انقلاب کی ابتداء سے تاجرانہ سرمایہ داری کے ظہور اور انٹرنیٹ کی خیالی دنیا کے قیام سے خلائی تسخیر کے کارناموں تک دیکھا جائے تو یہ سب کچھ بنیادی طور پر تیل کے بے محابا استعمال کی ایک دلچسپ داستان ہے اور بس۔ یہ عہد جسے ہم بجا طور پر تیل کا عہد کہہ سکتے ہیں عالمِ انسانیت کے لیے ایسی اکتشافات وایجادات سے عبارت ہے جس کی کوئی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور شاید نہ آنے والے دنوں میں مل سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیل کی دریافت سے زندگی کے طورطریقوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی واقع ہوگئی ہے حتی کہ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا بلکہ غور وفکر کے انداز تک یکسر بدل گئے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب اس سرزمین پر چھ بلین کی آبادی موجود ہے لیکن اس کے باوجود اشیائے خورد ونوش کی بہتات ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ ابن بطوطہ اور مارکو پولو سے کہیں زیادہ سفر کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔طول العمری کا اوسط ماضی کے مقابلے میں خاصا بڑھ گیا ہے۔ اینٹی بایوٹک اور دردکش دواؤں کے سہارے جسمانی آلام پر بھی بڑی حدتک قابو پایا جا سکا ہے ۔گویا انسانی تہذیب اپنے سفر میں جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے تیل کی مزید مقدار ہماری بقیہ ماندہ کلفتوں کا مداوا کرسکتی

ہے۔

یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئے۔ آج جب تیل کی قیمت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہوچکی ہے اور اس مسلسل بڑھتی قیمت نے عالمی سطح پر مختلف قسم کے اندیشوں کو جنم دیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اچانک خواب سے بیدار ہوگئے ہوں۔ شاید پہلی بار عوامی سطح پر یہ احساس عام ہوا ہے کہ ہم جس بے سمت ترقی کی راہ پر اب تک گامزن تھے وہ بنیادی طور پر تیل کے بے محابانہ استعمال کا ایک روشن پہلو تھا۔ گذشتہ سو سال کے عرصے میں تیل پر ہمارا انحصار اس قدر بڑھتا گیا کہ اب جب تیل کی بڑھتی قیمتیں ہماری معیشت کا کس بل نکالتی محسوس ہوتی ہیں ہم پر اچانک یہ انکشاف ہوا ہے کہ تیل جو ہماری تہذیب کا ایندھن ہے شاید بہت جلد ختم ہونے کو ہے۔ اور اگر ایسا ہوگیا تو ہماری اس مبنی بر تیل تہذیب کا کیا ہوگا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری تہذیب ایک ایسے راستے پر محوخرام ہے جہاں تاریخ کا پردہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرجاتا ہو۔ ان باتوں کو قربِ قیامت کی پیش گوئیوں پر قیاس کرنا شاید مسئلہ کی سنگینی سے پہلوتہی ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستقبل کے اس بھیانک منظرنامے کا کھلی آنکھوں اور ٹھنڈے دل ودماغ سے تجزیہ کیا جائے۔

مسئلہ کی تفہیم کے لیے چند مثالیں شاید چشم کشا ہوں۔ پلاسٹک کی خوبصورت بوتلوں میں پانی کی ایک بوتل جو ہماری میز پر پہنچتی ہے اس پر کم از کم دو بوتل تیل کا صرفہ آتا ہے۔ یہ اس طرح کہ پانی نکالنے کے لیے زیر زمین کھدائی، پانی کی تطہیر اس کی پیکنگ اور بالآخر دور دراز مقامات تک ان بوتلوں کو صارفین کے ہاتھوں میں پہنچانے تک خاصا تیل جل چکا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ پلاسٹک کی جن بوتلوں میں یہ پانی فروخت ہوتا ہے وہ بھی تو تیل ہی کی تطہیر کے دوران ان سے کشید کئے گئے مادوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں بالخصوص امریکہ میں، تیل کے بے محابا استعمال کی کہانی مجرمانہ بلکہ بہیمانہ حد تک افسوس ناک ہے۔ تنہا امریکہ عالمی پیداوار کا ایک چوتھائی تیل خرچ کرڈالتا ہے۔ سال ۲۰۰۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق امریکہ میں ایک کیلوری اجناس خوردونوش کی پیداوار پر تقریباً دس کیلوری تیل اور اس کے متعلقات کا صرفہ آتا ہے۔ ڈیل پی فر (Dale Allen Pfeiffer) نے اس تناسب پر تبصرہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ سچ پوچھئے تو لوگ غذا نہیں کھاتے بلکہ بالواسطہ طور پر تیل اور اس کے متعلقات کھا رہے ہیں۔ (دیکھئے fromthewildeness.com) اجناس کی پیداوار اور اشیائے خوردونوش کی ترسیل وتنظیم

میں، حتیٰ کہ کھاد اور اس کے متعلقات سے لے کر کھیتی باڑی کے سامان مثلاً ٹریکٹر، آب پاشی اور غلہ اکٹھا کرنے سے لے کر اسے دوسری جگہ منتقل کرنے تک تیل کے بنیادی رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فی زمانہ اشیائے خورد ونوش کا طویل مسافت طے کرنا اور ان چیزوں کا بھی بیرون ممالک سے برآمد کرنا جو مقامی طور پر دستیاب ہوں معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ مثال کے طور غیر مسکر حلال بیئر جو ہالینڈ اور سوئزرلینڈ میں کشید کی جاتی ہے ہزاروں میل دور شائقین کے لیے مکہ اور مدینہ کے شہروں میں دستیاب ہوتی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کو طویل مسافت سے برآمد کرنے کے بجائے مقامی طور پر اس کی پیداوار کہیں زیادہ مناسب ہے لیکن جدید طرزِ فکر ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی جینے کا یہ طریقہ دراصل گلوبلائیزیشن کی برکتوں کا ظہور ہے۔

کسی بھی قابل ذکر شئے کو لیں اس کے پیچھے آپ تیل کے عمل دخل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ موٹر کار ہو یا کمپیوٹر، مائکرو چپ ہو یا فلک بوس عمارتیں یہ سب کچھ تیل ہی کی رہین منت ہیں۔ ایک مائکرو چپ کی ہی مثال لیجئے جو بظاہر انگلی بھر ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا ٹکڑا نظر آتا ہے لیکن صرف اس چھوٹے سے پلاسٹک کے ٹکڑے کو بنانے پر تیل کی بڑی مقدار صرف ہوتی ہے ۔ امریکی کیمیکل سوسائٹی کے مجلّہ *Environmental Science and Technology* (Dec 2002) کے مطابق 32MB DRAM کے بننے میں کوئی ساڑھے تین پونڈ تیل خرچ ہوتا ہے اس پر 70 پونڈ پانی کا خرچہ مستزاد ہے۔ جوئیل گاریو کی زبانی اس داستانِ حماقت کی تفصیل آپ بھی سنئے:

> مائکرو چپ علیحدہ علیحدہ نہیں بنائے جاتے بلکہ انہیں بیک وقت سلکن ویفر کے اوپر طبع کیا جاتا ہے جس کا قطر چار انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سلکن ویفر پر یکے بعد دیگرے مختلف سطحیں اس طرح چھاپی جاتی ہیں کہ بظاہر تو وہ ایک چھوٹا سا چپ نظر آتا ہے لیکن مختلف غیر مرئی طباعت کی وجہ سے اس میں خاصی قوت مدافعت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس عمل میں توانائی کی ایک بڑی مقدار صرف ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر غیر مرئی سطح کے طبع کرنے پر اس چھوٹے سے چپ کو بار بار اس طرح پکا یا جاتا ہے کہ اس کا درجۂ حرارت ٹکنالوجی کی بلند سطح تک جا پہنچتا ہے۔
>
> (*The Nine Nations of North America*, p271, 1981)

تیل کے متعلقات مثلاً پلاسٹک ، مصنوعی روئی، مصنوعی ربر ، ہائٹروجن کھاد اور صابن وغیرہ نے

ہمارے اردگرد کی دنیا کو نئی شکل دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ تعمیراتی سامان ہو یا مصالحہ، پلاسٹک کے پائپ ہوں یا الکٹرانک سامان، فرنیچر ہو یا تصویر کشی میں استعمال ہونے والی فلمیں یا اندرونِ خانہ استعمال میں آنے والے آرائشی ساز وسامان یہ سب دراصل تیل کے تلچھٹ سے بنائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قالینیں، پردے، بستروں کے گدے، فائبر کے گلاس، پیرا کی کے لباس، پانی کے اندر استعمال ہونے والے کپڑے، شب خوابی کے رومانی ملبوسات گویا آپ جس چیز کا بھی نام لیں پتہ چلے گا کہ وہ پالسٹر یا سینتھٹک فائبر کی ہی کوئی بدلی ہوئی شکل ہے۔ موٹر گاڑیوں کی چہل پہل جس پر ہماری تہذیب کا دار و مدار ہے صرف تیل کے صرفے پر نہیں چلتی بلکہ تیل ہی سے تعمیر بھی کی جاتی ہے کہ مصنوعی ربر کے بغیر گاڑیوں کے سبک رفتار پہیے وجود میں نہیں آسکتے۔ اکرائلک کے مصنوعی دھاگوں نے آج بڑے پیمانے پر اونی اور سوتی کپڑوں کی جگہ لے لی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو زمین کی فطری پیداوار چھ بلین انسانوں کا جسم ڈھکنے کے لیے قطعی ناکافی ہوتی۔ کچھ یہی حال اجناس کی پیداوار کا بھی ہے کہ اگر تیل کی تلچھٹ سے پیدا ہونے والی کھادوں کا استعمال ترک کر دیا جائے تو ہماری زمین کے لیے چھ بلین انسانوں کے لیے غلہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ تیل نہ صرف یہ کہ ہماری مشینی زندگی کی جان ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نئی تہذیب بنیادی طور پر تیل اور اس کی تلچھٹ کی ہی رہین منت ہے۔

اب آیئے ذرا زمینی دنیا سے دور اس عالمِ خیال کا بھی کچھ بیان ہو جائے جسے ہم انٹرنیٹ کہتے ہیں اور جسے بجا طور پر اس دنیا کا توسیعہ سمجھنا چاہیے۔ انٹرنیٹ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مشین ہے جس میں لاتعداد کمپیوٹر اور اس کے متعلقات دنیا بھر میں پھیلے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ ہر لمحہ دنیا میں کروڑ ہا کمپیوٹر انٹرنیٹ کے سرور اور ان سے متعلق مختلف نوعیت کی چھوٹی بڑی مشینیں مسلسل بجلی کے صرفے میں مصروف ہیں۔ اس خوف کے باوجود کہ انٹرنیٹ کی غیر معمولی توسیع اور صارفین کا مسلسل بڑھتا دباؤ اس نظام کو کسی وقت بھی لے ڈوبے گا، حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اب انٹرنیٹ پر اپنی موجودگی کے لیے تگ و دو کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ انٹرنیٹ پر موجود ہیں تو اس دنیا میں آپ کا وجود ہے ورنہ نہیں۔ مالیاتی ادارے، اکتشافی علوم کی تجربہ گاہیں، طب وصحت کا جدید نظام، سیر وتفریح کے ادارے اور دانش گاہیں گویا ہر کوئی اب بڑی حد تک انٹرنیٹ پر انحصار کرتا ہے۔ عام طور پر اس طرف ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ انٹرنیٹ مجموعی توانائی کا ایک قابل ذکر حصہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

امریکہ میں بجلی کی ۴ء۹ فیصد پیداوار اور دنیا بھر میں مجموعی طور ۳ء۵ فیصد انٹرنیٹ کے نظام کو متحرک رکھنے میں صرف ہوجاتی ہے۔ (دیکھئے Uclu.com) موجودہ دنیا کی پر آسائش طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے ایک امریکی مصنف جے، ایچ کونسٹلر نے اپنی کتاب *The Long Emergency* میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ تیل کی پیدا کردہ سہولتوں نے ایک شخص کے لیے اتنی ہی سہولتیں پیدا کردی ہیں جو زمانۂ قدیم میں تین سو غلاموں کی فراہمی سے پیدا ہوتی تھی۔ اب جب دنیا میں تیل ختم ہونے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں تیل کی تہذیب کا پیدا کردہ یہ نیا عہد غلامی بھی اب رخصت ہوا چاہتا ہے۔

دیکھا جائے تو تیل کا غیاب ہماری تہذیب کے غیاب سے عبارت ہوگا۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے جب ہم نے تیل کی دریافت کی اور اسے اپنی آسائش کے لیے مسخر کیا۔ دیکھتے دیکھتے تیل نے ہماری زندگی کا انداز کچھ اس طرح بدل دیا کہ دنیا ہمارے لیے یکسر مختلف ہوگئی۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ بالکل اسی طرح جب تیل کے کنویں اچانک خشک ہوجائیں گے، مابعد تیل کی تہذیب میں ہمارا داخلہ ایک ایسے بحران کو جنم دے گا جس کا واقعی اندازہ لگانا ابھی مشکل ہے۔ ذرا غور کیجئے آج اگر تیل کی رسد اچانک رک جائے تو ہمارا کیا حال ہو۔ جدید دنیا آناً فاناً زمین بوس ہوجائے، اشیائے خوردونوش کی سپلائی سے لے کر پانی کی فراہمی، بیت الخلاء کا استعمال، گویا نئی تہذیب کے تمام جلوے چشم زدن میں ہوا ہوجائیں۔ افسوس کہ مستقبل کا یہ منظر نامہ جو بظاہر سائنس فکشن محسوس ہوتا ہے اب ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے۔

بدقسمتی سے اب ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہورہے ہیں جب تیل کے کنوؤں کے خشک ہونے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ جب سے ہم نے تیل دریافت کیا اور اس کے اندھا دھند استعمال سے ایک نئی تہذیب کی داغ وبیل ڈالی تب سے اب تک کوئی ستر اسی سال کے عرصے میں ہم نے دریافت شدہ ذخائر کا کوئی پچاس فی صد تیل استعمال کر ڈالا ہے۔ فی زمانہ معاشی اور صنعتی منظر نامے پر ہندوستان اور چین کے ظہور سے اس سوال کی دھار خاصی تیز ہوگئی ہے کہ تیل کا بقیہ ماندہ پچاس فیصد ذخیرہ کسے خرچ کرنے کا موقع ملے گا۔ امریکہ اور یورپ میں معاشی ترقی کے تجربوں نے اس کلیہ کی صداقت واضح کردی ہے کہ جو ملک جتنا زیادہ تیل صرف کرے گا وہاں اتنی ہی زیادہ صنعت وجود میں آئے گی، پیداوار میں اضافہ ہوگا اور اتنی ہی زیادہ خوشحالی اس ملک کے حصے میں آئے گی۔ اگر تین سو ملین آبادی پر مشتمل امریکی معاشرہ پچیس فی صد عالمی پیداوار صرف کرنے کے نتیجے میں ایک معاشی قوت بن کر ابھر سکتا ہے تو ذرا غور کیجئے کہ ہندوستان

اور چین جو امریکہ کی تین گنا اور چار گنا آبادی پر مشتمل ہیں اگر اسی درجے کی خوشحالی کے لیے اس طرح تیل صرف کرنے کی دوڑ میں لگ گئے تو مستقبل میں تیل کی اس تہذیب کا کیا ہوگا۔ حالات اس بات کی طرف مسلسل اشارے کررہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں مختلف اقوام وملل کے مابین تیل کے حصول کے لیے رقابت اور رسہ کشی تیز ہوتی جائے گی۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں جس طرح تیز رفتاری سے صنعتی معاشرے وجود میں آرہے ہیں آنے والے دنوں میں اتنے بڑے پیمانے پر انہیں تیل کی بآسانی فراہمی ممکن نہ ہوسکے گی۔ ترقی یافتہ ممالک نے گذشتہ ستر سالوں میں جتنا تیل صرف کیا ہے اتنا تیل، یعنی پچاس فی صد بقیہ ماندہ ذخیرہ، ترقی پذیر ممالک کے ہاتھوں پچیس تیس سالوں میں خرچ ہوجائے گا۔ پھر آنے والے دنوں میں تیل کے بغیر تہذیب کی شکل وصورت کیا ہوگی۔ یہ وہ منظر نامہ ہے جس کے حقیقی ادراک کی نہ تو کسی میں ہمت ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی گوشے سے کوئی مؤثر آواز سنائی دیتی ہے۔

تیل کے موجودہ ذخائر جس کا نصف ہم نے محض ستر سالوں میں جلا ڈالا ہے ان کے بنانے میں سورج کی شعاعوں کو کوئی پانچ سوملین سالوں تک محنت کرنا پڑی ہے۔ انسانی تاریخ کی اس عظیم نعمت کو ہم نے اپنی غیر منصوبہ بند جاہلانہ روش کے ذریعے انتہائی مختصر مدت میں صرف کر ڈالا۔ حقیقی معنوں میں تیل کا عہد ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا جب بڑے پیمانے پر تیل کے عمل دخل نے ہماری تہذیب کا قالب بدلنا شروع کیا اور اگر تیل کے صرفے کی یہی رفتار جاری رہی تو ۲۰۳۰ء تک بقیہ ماندہ ذخیرہ ختم ہوجائے گا۔ مغربی ماہرین جب پیک آئل (peak-oil) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے ہم تیل کی نصف دریافت شدہ مقدار صرف کر چکے ہیں یا اب اس نشان کو بہت جلد پہنچنے والے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں امریکہ کے حوالے سے ایم، کے، ہبرٹ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ امریکہ میں تیل کی پیداوار ستر کی دہائی میں اپنے عروج کو جا پہنچے گی جس کے بعد امریکی تیل کی پیداوار میں زوال آجائے گا۔ ہبرٹ کی یہ پیش گوئی دریافت شدہ ذخائر کے تجزیے پر مشتمل تھی جو بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ البتہ اگر ذرائع ابلاغ نے اسے اس وقت خطرے کی گھنٹی کے طور پر پیش نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس اثناء دنیا کے مختلف علاقوں میں تیل کے نئے ذخیرے مسلسل دریافت ہورہے تھے۔ البتہ آج صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہم بہت جلد اس نشان کو عبور کرنے والے ہیں جسے پیک آئل کہا جاتا ہے، بلکہ گذشتہ برسوں میں نئے ذخائر کی دریافت بھی تقریباً معدوم ہوتی گئی ہے۔ کونسٹلر کے مطابق سال ۲۰۰۰ء میں سولہ

نئے ذخائر دریافت ہوئے ۲۰۰۱ء میں آٹھ جب کہ ۲۰۰۳ء میں کسی نئے ذخیرے کی دریافت سے ہم عاجز رہے۔ پیک آئل کے سلسلے میں ماہرین میں قدرے اختلاف ہے ۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں ہم تیل کا پچاس فی صد ذخیرہ ختم کر چکے، کوئی کہتا ہے کہ ابھی اس نشانے تک پہنچنے میں دو چار سال کی مہلت اور باقی ہے۔ البتہ اس بارے میں ایک بڑے حلقے کا اتفاق ہے کہ دریافت شدہ ذخیروں میں جوں جوں کمی کا احساس بڑھتا جائے گا تیل کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ رسد اور طلب کے مابین توازن کا برقرار رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ پھر دنیا کا مستقبل اس سوال کے گرد گردش کرے گا کہ بقیہ ماندہ پچاس فی صد تیل کے ذخیرے کو کس کمال تدبیر کے ساتھ خرچ کیا جائے۔ اس سوال کے جواب پر عالم انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہوگا۔ تیل کے لیے باہم مسابقت جوں جوں بڑھے گی اندیشہ ہے کہ مختلف ممالک تیل میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے خود کو ایک لامتناہی کشمکش بلکہ جنگوں میں گھرا پائیں گے۔ ۲۰۰۶ء میں جب امریکی صدر جارج بش نے امریکی قوم کے نام اپنے خطاب میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ امریکہ کو تیل کی لت پڑ چکی ہے تو دراصل وہ غیر شعوری طور پر اس خطرناک مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو قوت کے نشے سے سرشار قوم مجبور و بے بس قوموں کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ جب امریکہ کو تیل کی لت پڑ چکی ہو، جس کا اعتراف بہانگ دہل اس کے صدر کی زبانی ہوتا ہو، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تیل کی پیاس بجھانے کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں کیا کچھ نہ کر گزرے گا۔ بش اور چینی دونوں کا تعلق تیل کی صنعت سے ہے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ جدید زندگی میں تیل کی کیا اہمیت ہے۔ اس وسیع تناظر میں اگر امریکی اقدام پر نظر ڈالیے تو عراق اور افغانستان میں امریکی جنگی عزائم کے پیچھے مختلف پر اسرار حقیقتوں کا سراغ بآسانی لگ سکتا ہے۔ تیل کی بنیادی اہمیت اور اس کے ختم ہوتے ذخائر نے اب اس سوال کو جنم دیا ہے کہ آنے والے دنوں میں زندہ رہنے کا حق کسے ہے۔ عراق میں چار ہزار امریکی فوجیوں کی ہلاکت اور انتیس ہزار فوجیوں کے معذور ہونے کے بعد بھی اگر امریکی عراق سے واپسی میں دیر لگا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اب خون کے بدلے تیل کی تجارت کا آغاز ہو چکا ہے۔

سال ۲۰۰۵ء میں مجھے اٹلی کے سیاحتی شہر وینس میں سائنس کے مستقبل پر پہلی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جہاں مسلسل کئی گھنٹوں تک مستقبل کے ایندھن کے بارے میں دنیا کے بہترین دماغ بحث و مباحثہ میں مصروف تھے۔ ہائڈروجن کو تیل کے متبادل کے طور پر دیکھنا کوئی نیا خیال نہیں ہے البتہ اس

کو سستا اور قابلِ عمل بنانا ہنوز ایک شاعرانہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ رہی شمسی توانائی سے ایندھن کے حصول کی بات تو واقعہ یہ ہے کہ اس عمل میں جتنی توانائی صرف ہوتی ہے، شمسی پینل کی تعمیر اور اس کی ترتیب وتہذیب میں جتنا ایندھن استعمال ہوجاتا ہے، شمسی شعاعوں کے ذریعے اتنی انرجی کا حصول بھی ممکن نہیں ہوتا۔ رہا کوئلہ یا قدرتی گیس تو اس کے بھی ذخائر محدود ہیں اور یہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسی تہذیب کو سہار سکتے ہیں جسے انیسویں صدی کی تہذیب کہا جاسکتا ہے۔ یہی حال نیوکلیائی توانائی کا ہے۔ اگر پوری دنیا نیوکلیائی توانائی کو اپنا ہدف بنالے تو یورینیم بھی بہت دنوں تک ہمارا ساتھ نہ دے پائے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل نے جس طرح ہماری زندگی کے مظاہر بدل ڈالے ہیں ان مظاہر کو سہارنے کی قوت کسی دوسرے متبادل ایندھن میں نہیں ہے۔ ہواؤں کے فطری بہاؤ اور موجوں کی روانی سے بھی ایندھن اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ہم ایسا کرنے پر مجبور ہوئے تو وہ ایک دوسری دنیا کا منظر نامہ ہوگا۔

تیل کی تہذیب کا یہ تاریک پہلو اگر اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے ہمارے ذرائع ابلاغ سائنسی اکتشافات کا صرف خوشنما پہلو پیش کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں BBC4 میں مستقبل کے حوالے سے جو منظر نامہ دکھایا گیا ہے اس میں مستقبل بظاہر بڑا دلچسپ نظر آتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں انسانی اعضائے رئیسہ تجربہ گاہوں میں بنائے جارہے ہوں، جہاں ابعاد ثلاثہ کے ٹیلی ویژن ہمارے حظ کا سامان فراہم کرتے ہوں، انسان نما روبوٹ ہماری خدمت پر مامور ہوں اور سب سے حیرت انگیز یہ کہ ٹیلی فون کی آوازوں اور ڈیجیٹل پیغامات کی طرح مادی اشیاء کی ترسیل بھی ممکن ہوگئی ہو۔ میشیو کاکو جو ایک معروف سائنسی مفکر ہیں ان کا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں انسان بے جان اشیاء سے جاندار پیدا کرنے پر قادر ہوسکے گا اور تقریباً اسے وہی قوت حاصل ہوجائے گی جو اب تک صرف خدا کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کے بیانات سننے کے بعد معاً یہ خیال آتا ہے کہ کیا عہد جدید کے سائنسی مفکرین تہذیب کے دوسرے رخ سے بھی آگہی رکھتے ہیں۔ جو لوگ مستقبل کے سلسلے میں ان حسین خوابوں کی تعمیر میں مصروف ہیں کیا انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں کہ جب آنے والے دنوں میں تیل ہی نہ ہوگا تو مستقبل کی اس مشینی زندگی کا جاری رکھنا کیسے ممکن ہوسکے گا۔ رہی یہ بات کہ جو لوگ بڑی آسانی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر تیل ختم ہوا تو انسان کچھ اور دریافت کرلے گا وہ شاید اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ کچھ اور کی دریافت میں نصف صدی بیت گئی حتی کہ ہم تیل کے لیے مسابقت اور جنگوں کے مرحلے میں داخل

ہو چکے ہیں۔ بعض سائنسی مفکرین جن میں کاکو بھی شامل ہیں مسئلہ کی سنگینی کو نظر انداز کرتے ہوئے تصوراتی متبادل سے کام چلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر زمین پر موجود انرجی کے تمام ذخائر ختم ہوگئے تو ہم دوسرے سیاروں پر اپنی کمندیں ڈالیں گے۔ کاکو کا خیال ہے کہ ہماری کہکشاں میں بہت سے ایسے سیارے بھی پائے جاتے ہیں جن پر زندگی کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔ جنہیں ہم مردہ سیارے سمجھتے ہیں وہ در اصل انرجی کے ذخائر ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ زمین کا ہر طرح عرق کشید کر لینے کے بعد ہم دوسرے سیاروں کا رخ کریں گے۔ زمین پر انسانی تہذیب کی تباہی کے پیش نظر بعض لوگوں نے یہ منصوبہ بھی بنا رکھا ہے کہ چاند پر سفینۂ نوح کے بمثل ایک ایسی لائبریری تعمیر کردی جائے جس میں انسانی تہذیب کو محفوظ کیا جاسکے تاکہ مستقبل میں زمین کی تباہی کے نتیجے میں انسانی تہذیب کا اگر یکسر خاتمہ ہوجائے تو مستقبل کے انسانوں کے لیے تہذیب کے کچھ باقیات محفوظ رہ سکیں۔

جب سے کارل ساگن نے سائنس کو عوامی گفتگو کا موضوع بنایا ہے اور جب سے خلائی سائنس ٹیلی ویژن کے ذریعے ہمارے ڈرائنگ روم کا حصہ بنی ہے سائنس کے مستقبل کے سلسلے میں سائنس فکشن کے انداز میں گفتگو کرنے کا رواج خاصا عام ہوگیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے اعداد وشمار کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا اور ذرائع ابلاغ مسئلہ کے صرف اس پہلو پر گفتگو کرنا مناسب جانتے ہیں جو عوامی ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ بی بی سی ۴ کا مقبول عام پروگرام جس کا ابھی ہم نے حوالہ دیا اس قبل کی بہترین مثال ہے جس میں پندرہ بیس سالوں کے اندر نئی نیوکلیائی ٹیکنالوجی (fusion) سے بجلی کے حصول کا خواب دکھایا گیا ہے۔ مستقبل کی اس دنیا میں انتہائی ترقی یافتہ انسان نما روبوٹ میدان جنگ میں نبرد آزما دکھائے گئے ہیں اور اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ جلد ہی کینسر، امراضِ قلب اور دیگر مرض الموت پر نہ صرف یہ کہ قابو پایا جاسکے گا بلکہ انسان اپنے جسم کو مکمل طور پر کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اور درازئی عمر پر یکسر روک لگ جائے گی۔ ایک ایسی دنیا کا خواب جہاں انسان مستقبل کو اپنی مٹھی میں کرسکے در اصل ساگن جیسے سائنس دانوں کے رومانی خیالات کا پروردہ ہے۔ ساگن عالم موجودات کے سلسلے میں سائنسی سے کہیں زیادہ رومانوی نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کروڑ ہا کروڑ کہکشاں میں نہ صرف یہ کہ زندگی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ قائم ہے بلکہ ایک سیارہ کے لوگ دوسرے سیاروں سے رابطے کے لیے ایک دوسرے کو مسلسل برقی ومقناطیسی سگنل بھیج رہے ہیں۔ البتہ صدیوں پہلے بھیجے گئے یہ اشارے اگر اب تک ہماری یافت سے باہر ہیں تو اس کی وجہ سیاروں کے مابین طویل مسافت ہے۔ اس میں شبہ نہیں

کہ سا گن جیسے عظیم سائنسدانوں کی تحریروں اور تقریروں سے سائنس کے عوامی قالب کی تشکیل میں بڑی مدد ملی البتہ ان کے رومانوی تصورات نے ان حقائق پر پردہ ڈال دیا جو عملی دنیا میں سائنس کو مستقبل کے حوالے سے درپیش ہیں۔ کہکشاں پر کمندیں ڈالنا ایک امید افزاء خیال تو ضرور ہے۔البتہ اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ اب تک جس انداز سے ناسا نے خلائی مشن کو انجام دیا ہے جس طرح اس پر بے دریغ دولت اور تیل کی گرانقدر مقدار صرف ہوتی رہی ہے اس طرز تحقیق وجستجو کی بہت زیادہ گنجائش اب مشکل دکھائی دیتی ہے۔ بظاہر یہ خیال خوش کن ضرور ہے کہ انسان ایندھن کی تلاش میں دوسرے سیاروں کا رخ کرے لیکن اس تلخ حقیقت کو کیا جائے کہ آنے والے دنوں میں جب تیل کے ایک ایک قطرے کے لیے قومیں باہم برسرِ پیکار ہوں گی تب اس تفریحی خلانوردی کے لیے تیل کہاں سے آئے گا۔بعض لوگ نباتاتی ایندھن کو مسئلہ کا حل بتاتے ہیں۔ یقیناً نظری طور پر نباتاتی ایندھن متبادل کے طور پر سامنے آسکتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر تیل کے کنویں خشک ہوگئے تو پٹرول سے بننے والی کھاد بھی عنقا ہوجائے گی پھر زمینوں میں وہ زرخیزی نہ رہے گی جس کا فی الوقت ہم مشاہدہ کررہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ ہم ایندھن کی کھیتی کریں یا اشیائے خوردونوش کی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ تیل کے غیاب اور اس کی کھاد کے عنقا ہوجانے سے اجناس کی پیداوار میں اچانک اتنی کمی واقع ہوجائے گی کہ دنیا کی دوتہائی آبادی فتنہ وفساد اور فاقوں کے عتاب تلے دم توڑ دے گی۔

مستقبل کا غیاب

اگر تیل کی اس تہذیب کو اسی طرح انگیز کیا جاتا رہا تو ایک خوفناک تباہی ہمارا مقدر ہوگی۔گذشتہ نصف صدی میں اس سلسلے میں ہم سے خاصی غفلت ہوچکی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لینے پر مجبور ہیں جہاں زندگی کے سلسلے میں مایوسی عام ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہوں جو اپنے اختتام کو بہت پہلے پہنچ چکی ہو۔ ہماری زندگیوں میں لطف وانبساط اور جلوہ سامانیوں کا فقدان ہے۔ایسا لگتا ہے گویا ہم تہذیب کے اختتام کے بعد، اس کے تلچھٹ (residue) کے طور پر جینے پر مجبور ہوں۔مغرب میں اس احساس کو مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا کا منظر نامہ ہے جہاں زندگی جینے کی امنگ ختم ہوچکی ہواور صاف محسوس ہوتا ہو کہ اب کسی بلند اور ارفع تصور کا حصول انسانوں کے بس سے باہر ہے۔ بظاہر یہ ایک لغو خیال معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید کے لوگ مابعد جدید عہد

میں جیتے ہوں، لیکن جو لوگ اس تہذیب کے نبض شناس ہیں انہیں اس حقیقت کا کسی قدر ادراک ہے کہ جب احساسِ زیاں شدید تر ہو جائے اور آگے کا راستہ بند دکھائی دیتا ہو تو انسانوں کے لیے ہلا دینے والی قنوطیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو مابعد تاریخ کے بجائے عین تاریخی لمحات میں جینا چاہتے ہوں جو ایک ایسی دنیا کے متلاشی ہوں جہاں ہر لمحہ وقوعات کا ظہور پایا جاتا ہو، جہاں زندگی جینا سراسر لطف سے عبارت ہو، فطرت استعمال کر کے پھینک نہ دی گئی ہو اور زندگی سریع لمحاتی حظ کا نام نہ ہو، تو ان کے لیے لازم ہو گا کہ وہ مروجہ تصورِ حیات اور فکری چوکھٹے سے یکسر باہر آ کر غور وفکر کی ہمت پیدا کریں۔ گذشتہ تین سو سالوں میں ہم نے غور وفکر کے جو چوکھٹے تشکیل دیئے ہیں اور فلسفیانہ مباحث کی جو ریت قائم کی ہے وہ بنیادی طور پر کسی نہ کسی گروہ یا قوم کے مفادات کے پیش نظر وضع کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گذشتہ تین سو سالوں کی فکری روایت کا ہر اعتبار سے قلع قمع کیا جائے تب ہی ہم غور وفکر کے نئے سانچوں کی مؤثر تشکیل کر سکیں گے۔

آیئے ذرا اس نکتے کی مزید وضاحت کی جائے۔ مغرب میں حریتِ فکر و نظر کی تحریک جس حادثے کا شکار ہوئی جسے عرف عام میں Enlightenment کے زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے خاصی بحث وتمحیص کا موضوع رہا ہے۔ البتہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے لکھے جانے والے بیشتر تحلیل وتجزیے اگر صورتِ حال کے واقعی ادراک سے عاجز رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تجزیہ نگاروں نے ان بنیادی تصورات کے محاکے کی کوشش کم ہی کی ہے جو ذہنی آزادی کی بے سمتی کے دوران پروان چڑھے اور جنہیں رفتہ رفتہ استناد حاصل ہو گیا۔ مثال کے طور پر تہذیب کے بنیادی تصور کو لیجئے۔ مغرب میں مہذب ہونا فی نفسہٖ کوئی جوہر نہیں بلکہ اقوام دیگر کے عادات واطوار کو اپنے خودساختہ پیمانوں سے ناپنے کا نام ہے۔ تہذیب یا civilization کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۷۵۶ء میں وکٹر رکیوٹی میرابو (Victor Riqueti Mirabeau) نے استعمال کی جس نے اس لفظ کو اہل فرانس کی خود ستائی سلسلے میں باندازِ ناقدانہ استعمال کیا۔ رفتہ رفتہ اس اصطلاح نے یورپ کی توسیعاتی مہم میں ایک استعماری نظریے کی حیثیت اختیار کر لی۔ انیسویں صدی میں جب یورپی اقوام دنیا کو تہذیب سے روشناس کرانے کے لیے مختلف سمتوں میں حملہ آور ہوئیں تو یورپ کی تہذیب محکوم اقوام کے لیے خیر وشر کا معیار بن گئی۔ حتیٰ کہ یورپی مورخین نے اسی احساس برتری کے تحت تاریخ کی ضخیم مجلدات مرتب کر ڈالیں۔ ٹوائین بی جیسا مورخ جو اپنے معروضی تاریخی مطالعے کے لیے معروف ہے وہ بھی اس تہذیبی پروپگنڈے کی زد سے نہ بچ سکا۔ ٹو

ائین بی نے مغربی تہذیب کو عظیم سلطنت روما کے تسلسل کے طور پر دیکھا اور اس خیال کی وکالت کی کہ جہاں دوسری تہذیبیں معمولی عروج کے بعد انتشار کا شکار ہوگئیں یا تھک کر بیٹھ گئیں وہیں مغربی تہذیب نہ صرف یہ کہ غیر معمولی بلندیاں طے کرنے میں کامیاب ہوئی بلکہ اب بھی اس میں مزید آگے بڑھنے کی صلاحیت باقی ہے۔ گوکہ سولھویں اور سترھویں صدی میں قوم پرستی اور مغربی جنگوں نے اس پر وقتی طور پر منفی اثرات ڈالے تھے۔ یہ سوال کہ اگر دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے اندر اب بھی ایک عالمی حکومت کے قیام کا دم خم باقی ہے تو کیا اسے اس بات کی اجازت ملنی چاہیے کہ وہ بزور بازو ہی سہی انسانیت کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے آگے آئے۔ٹوائین بی اور اس قبیل کے مصنفین تہذیبی واہمے کے اس قدر اسیر ہیں کہ وہ ہر قیمت پر مغرب کے تہذیبی مظاہر کو برپا کرنا انسانیت کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بقول ٹوائین بی: ''تہذیب اگر چرچ کے زوال کے نتیجے میں پیدا ہوتو اسے تباہی پر محمول کرنا چاہئے۔البتہ کسی تہذیب کی تباہی سے کوئی نیا چرچ یا نئی مذہبیت کو اعتبار ملے تو اسے تباہی پر محمول نہیں سمجھنا چاہئے''۔ فی زمانہ امریکہ میں نوقدامت پرستوں کا عروج اوران کے ہاتھوں تاریخ کی آخری جنگ کی تیاری، آرمیگاڈون برپا ہونے کی خبریں، کیا اس بات کی طرف اشارہ نہیں کررہی ہیں کہ ایک نیا چرچ نامحسوس طور پر ہمارے درمیان متشکل ہورہا ہے۔

مغرب میں جو لوگ اس خیال کے قائل ہیں کہ انھوں نے تاریخ کو اپنی منشاء کے مطابق آخری منزل تک پہنچا دیا ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک فیصلہ کن تہذیبی جنگ کے آخری مرحلے میں تہذیب کے دشمنوں کو شکست سے دوچار کرنے والے ہیں وہ بھی دراصل اسی اصطلاح کے اسیر ہیں جسے عرف عام میں مغربی تہذیب کہا جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ مغربی تہذیب ایک لغو اور موہوم تصور ہے کہ اہل مغرب جن لوگوں کو تہذیب کا دشمن قرار دیئے بیٹھے ہیں وہ شہر کی فصیل سے باہر کہیں اور نہیں پائے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود اسی تہذیب کے اندر موجود ہیں۔متمدن برطانیہ میں ایک مسلم وزیر کا وجود، امریکہ میں ایک ہندو گورنر کی موجودگی اور وہائٹ ہاؤس کی دوڑ میں ایک سیاہ فام کی مقبولیت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مغربی تہذیب جن مظاہر سے عبارت ہے اسے اب سفید فام اقوام سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں۔ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ آخر مغربی تہذیب کو محض برطانوی، فرانسیسی یا جرمن شناخت کے تناظر میں کیوں دیکھا جاتا ہے۔کیا صرف یہ تین بڑے ملّی تشخص مغربی تہذیب کا اعلامیہ ہیں؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں یہ تینوں اقوام اپنے تفوق کے لیے باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔

مغربی تہذیب کی واقعی نمائندگی کا حق کسے حاصل ہے؟اس تہذیب کی بنیادی کتابیں اور فکری مآخذ کیا ھیں؟ کیا یورپ کی مسلم ریاستیں مثلاً بوسنیاہرزیگوونیا، کوسو واور ترکی اسی تہذیب کا حصہ ہیں یا اسلام سے ان کی وابستگی نے انہیں اس تہذیب سے خارج کر دیا ہے؟ کیا اہل یہود جنہیں اس تہذیب کی بعض امہات الکتب مثلاً *Relativity: The Special and General Theory, The Interpretations of Dreams, The Selfish Gene* لکھنے کا شرف حاصل ہے، وہ اسی تہذیب کا حصہ کہے جائیں گے؟ تو کیا مغربی تہذیب یہودی عیسائی کوششوں کا امتزاج ہے؟ ایسا یقین کرنا آسان نہیں کہ مغرب میں اہل یہود ہمیشہ اجنبی عنصر کے طور پر دیکھے گئے ہیں، اور ان کے خلاف مخاصمت کی طویل تاریخ پائی جاتی ہے۔ یہ خیال کہ مغربی تہذیب دراصل مابعد عیسائیت کے عہد میں پیدا ہونے والے خلاء سے عبارت ہے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا اس لیے کہ روسی کمیونسٹ جو اس تہذیب کے دشمن کے طور پر دیکھے جاتے رہے ہیں وہ بھی دراصل اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کمیونسٹوں کی کتابِ مقدس داس کیپٹل مغرب کے عین بطن میں معرض وجود میں آئی ہے۔ سچ پوچھئے تو مغربی تہذیب ایک ایسا نظری مفروضہ ہے جسے سرمایہ داروں نے اقوامِ عالم پر اپنی اجارہ داری کے لیے وضع کیا ہے اور بس۔

سرمایہ داروں نے ہمیں صرف تہذیب کے موہوم تصورات کا ہی اسیر نہیں کیا بلکہ ہماری فکر کو ان اصطلاحات کا تابع کر دیا جو خالصتاً سرمایہ دارانہ تہذیب کی مرہون منت تھیں۔ مثلاً ترقی، ارتقاء، آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق، حریت فکر جیسی اصطلاحیں سرمایہ دارانہ رنگ میں کچھ اس طرح رنگ دی گئیں کہ ان کے دوسرے معانی رفتہ رفتہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ مہذب زندگی کا تصور اب آزاد منڈی کی معیشت، صنفی مساوات، مجموعی قومی پیداوار اور فرد کی اوسط آمدنی سے لگایا جانے لگا۔ جب مہذب زندگی کے ان پیمانوں کو حتمی سمجھ لیا جائے تو پھر ان مفروضات کے تنقیدی تجزیے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داری کو نظری طور پر چیلنج کرنے کا امکان جاتا رہا۔ اس صورتِ حال نے سرمایہ داروں کے لیے بڑے پیمانے پر لوٹ کھسوٹ کے امکانات پیدا کر دیئے۔ کارنیگی اور راک فلر جنہیں امریکہ میں معماران قوم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے دراصل سرمایہ دارانہ نظام جبر کے قیام میں بھیانہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کہنے کو تو ان حضرات نے امریکہ میں رسل ورسائل کا وسیع نظام تعمیر کیا لیکن اس کے عوض انہوں نے بے پناہ قطع اراضی اپنے نام کرلی۔ اس بات کی طرف عام لوگوں کی توجہ کم ہی گئی کہ نئی دنیا کے یہ معمار دراصل لندن کے Rothschilds جیسے یہودی سرمایہ داروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یقیناً

شاہراہوں اور ریل گاڑیوں کے وسیع نظام کی تعمیر کا سہرا ان کے سر جاتا ہے البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان حضرات نے ہمارے دل ودماغ کی شاہراہوں کو مسدود کرنے میں بھی کلیدی رول انجام دیا ہے۔ ان دونوں نے غیر معمولی مالیت کے اوقاف تشکیل دیئے جس نے آنے والے دنوں میں امریکی نظام تعلیم اور فکر وتحقیق پر مکمل طور پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ سائنسی تحقیق کو اگر ایک طرف عسکری اور صنعتی اداروں کی خدمت پر مامور کیا گیا تو سماجی علوم سے امریکی تہذیب کی برتری اور عظمت کے پروپیگنڈے کا کام لیا گیا۔ آج اگر ہمارے دانشور سرمایہ دارانہ اصطلاحات میں کلام کرنے اور غیر شعوری طور پر اسی چوکھٹے میں سوچنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں تو اس کے پیچھے دراصل ان ہی سرمایہ دارانہ اوقاف کی کارفرمائی ہے۔

بعض بنیادی تہذیبی تصورات کو مخصوص معانی عطا کرنے اور جمہوری نظام پر سرمایہ داروں کی مکمل اجارہ داری سے پوری دنیا میں ترقی کے امریکی ماڈل کا زور شور سے چرچا ہوا اور اسے ترقی کا حتمی پیمانہ سمجھ لیا گیا۔ آنے والے دنوں میں سرد جنگ میں امریکہ کی فتح، متحدہ یورپ کا عروج اور ہندوچین میں آزاد منڈی کی معیشت کے فروغ سے ایسا محسوس ہوا گویا اب دنیا کے لیے امریکی ماڈل کے علاوہ کوئی متبادل نہیں رہ گیا ہے۔ معیشت کے مصنوعی ارتقاء اور معیار زندگی کی آسائشوں نے کوئی نصف صدی تک ہمیں صورتِ حال کے واقعی ادراک سے روکے رکھا۔ ہم اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ معیشت کا نمو اور زندگی کی چمک دمک کے پیچھے دراصل تیل کے بے محابا استعمال کو دخل ہے جو نئی تہذیب کے معماروں کو تقریباً مفت ہاتھ آگیا ہے۔ سرمایہ داروں نے پیداوار میں اضافے کے لیے ٹکنالوجی کو اس کی منتہا تک استعمال کرنے کی کوشش کی اور اس عمل میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ سستے تیل کے استعمال سے پیدوار میں جتنا اضافہ ممکن ہو کر لیا جائے۔ نئی معیشت جو دراصل تیل کے جلووں پر قائم تھی، نے ایک ایسی صورتِ حال کو جنم دیا جہاں زیادہ سے زیادہ تیل خرچ کرنا صنعت کے فروغ کی ضمانت بن گیا۔ جن قوموں نے جتنا زیادہ تیل صرف کیا ان کے یہاں دولت کے انبار لگ گئے۔ سرمایہ داروں کے لیے اس سے بہتر اور کیا صورتِ حال ہوسکتی تھی کہ وہ سستے تیل کے بے محابا استعمال سے بے پناہ سرمایہ اکٹھا کرلیں۔ تیل کی تہذیب پر چونکہ سرمایہ داری کی گرفت خاصی مضبوط تھی اس لیے سرمایہ داروں نے جس طرح چاہا تیل کی نعمت کو اپنی دولت کے اضافے کے لیے استعمال کیا۔ البتہ آج جب کہ تیل کے کنوؤں کے خشک ہونے کے آثار ہویدا ہیں اور صاف محسوس ہورہا ہے کہ ہم مابعد کاربن عہد کی طرف گامزن ہیں، سرمایہ داروں کو تیل کی ریفائنری قائم

کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں شاید انہیں اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب تیل ہی نہ ہوگا تو ریفائنری کے قیام پر کیوں پیسہ صرف کیا جائے۔

تو کیا آنے والے دنوں میں مبنی بر تیل مغربی تہذیب اچانک زمین بوس ہو جائے گی؟ میتھو سائمن جو امریکی صدر بش کے انرجی ایڈوائزر ہیں ان کا کہنا ہے کہ صورتِ حال انتہائی دھماکہ خیز ہے۔ ایک آن لائن مجلّہ fromthewilderness.com کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے اس مسئلہ کو دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیا جس کے بارے میں بقول ان کے اہل سیاست نے کوئی متبادل پلان نہیں تیار کر رکھا ہے۔ یونیورسٹی یا دوسرے اعلیٰ علمی اداروں سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس بحران کا کوئی حل پیش کریں گے لیکن تعلیمی اداروں پر سرمایہ داروں کی مکمل گرفت کے سبب اب اس بات کی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ ان اداروں سے کسی متبادل فکر کو فروغ مل سکے گا۔ دانش گاہوں میں اب غور فکر کا ماحول کہاں کہ اب ان کا بنیادی کام آزاد منڈی کی معیشت کے لیے دل و دماغ پیدا کرنا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ٹیکنالوجی کو سرمایہ کے فروغ پر مامور کر دیا گیا ہو، سرمایہ دار یہ کب چاہے گا کہ لوگ فلسفیانہ مباحث یا غور وفکر میں اپنا وقت ضایع کریں۔ انہیں تو ایک ایسی فوج کی ضرورت ہے جو تکنیکی نوعیت کا کام بڑے پیمانے پر انجام دے سکے۔ اعلیٰ علمی مقاصد کے خاتمے اور اس کی جگہ معلومات پر مبنی دانش گاہوں کے قیام نے سرمایا داروں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کمپیوٹر شناس انسانوں کی ایک ایسی فوج ظفر موج تیار کر دی ہے جو بیچارے نہ تو غور وفکر کی لذت سے آشنا ہیں اور نہ ہی انہیں زبان کا بنیادی شعور ہے جو غور وفکر کے لیے لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تجارتی نوعیت کے تعلیمی اداروں نے یک رخے انسان کو جنم دیا ہے جس کا مقصدِ وحید دولت کا زیادہ سے زیادہ ارتکاز ہے اور بس ۔ یہ حضرات اپنے بہترین لمحات میں اگر کچھ سوچ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ ماحولیاتی آلودگی پر کیسے قابو پایا جائے، خورد ونوش کی فطری اشیاء کے نظام کو کیسے بحال کیا جائے، صاف ستھرے قابلِ شُرب پانی کا حصول کیسے ممکن ہو۔ پہلے تو ان حضرات نے فطری وسائل کو تباہ کیا، ندی، نالے ، تالاب اور زمینوں کو مختلف قسم کے کیمیاوی چھڑکاؤ سے آلودہ کر دیا اور اب انہیں یہ فکر ستائے دیتی ہے کہ دنیا کو صاف پانی ، کھاد سے پاک غذا اور غیر آلودہ ہوا فراہم کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے مغربی تہذیب کے سخت ناقد رہے ہیں اور جنہیں مغرب میں اپنی تہذیب کے باغی کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے، انہیں بھی یہ فکر ستائے دیتی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں صاف ستھرے بیت الخلاء (فلش ٹوائلٹ) کا فقدان ہے۔ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ

روایتی معاشروں میں جہاں متبادل زندگی کا انداز اب بھی باقی ہے، جہاں زندگی کا فطری آبشار اب بھی بہہ رہا ہے وہاں نئی تہذیب کے ان مسائل نے ابھی انسانوں کو اپنی گرفت میں نہیں لیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان حضرات کے ہاں مہذب زندگی کا تصور صرف فلش ٹوائلٹ سے عبارت ہے۔

پس چہ باید کرد

خواہ ہم اس خیال کے قائل ہوں کہ آنے والے دنوں میں تیل کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہوجائے گا یا ان امید افزاء بیانات پر یقین کریں جن کا اظہار گاہے بگاہے تیل کی صنعت سے وابستہ حضرات کرتے رہے ہیں البتہ اس بحث کی حساسیت کا تقاضہ ہے کہ اسے عوامی گفتگو کا موضوع بنایا جائے۔ اوپیک کے تیسرے عالمی سیمینار ۲۰۰۶ء میں سعودی آرامکو کے صدر عبداللہ جمعہ نے دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اگر مستقبل کے سلسلے میں ان کے اندازے صحیح ثابت ہوئے تو دنیا کو ۱۴۰ سال تک تیل کی رسد اسی طرح جاری رہ سکے گی۔ عبداللہ جمعہ نے یہ اندازے دراصل ان مفروضات پر قائم کئے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں گی، تیل کے نئے ذخائر دریافت ہوں گے اور ہم موجودہ ذخائر کے آخری قطرے کو بھی نکال لینے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ تیل کی کیچڑ جسے اصطلاح عام میں بھاری تیل کہا جاتا ہے اور جسے اب تک قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا ہے، عبداللہ جمعہ کے اندازوں میں اس کیچڑ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ اس صنعت سے وابستہ ہونے کے سبب وہ بھاری تیل کو قابل استعمال بنانے کے اسرار وعواقب سے نا آگاہ نہیں ہیں کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتیجے میں جو آلودگی پیدا ہوگی اس سے گونا گوں قسم کے ماحولیاتی مسائل جنم لیں گے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تیل ختم ہورہا ہے یا ابھی اس کی خاصی مقدار باقی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس پورے قضیے میں ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا جانا چاہئے جس کے لئے بحیثیت مسلمان ہم خاص طور پر سزا وار ہیں۔

دنیا کے وہ بیس ممالک جن کے پاس تیل کے ذخائر کا ۹۵٪ حصہ ہے ان میں بارہ مسلم ممالک شامل ہیں جن کے پاس مجموعی طور پر تیل کا ۶۸٪ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ یہی حال قدرتی گیس کا ہے جس کے نصف سے زائد زخائر مسلم علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ روس کے بعد ایران اور قطر اس سلسلے میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ امت مسلمہ جو اس وقت ۵۷ چھوٹے بڑے ملکوں کا مجموعہ ہے نہ صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے اہم علاقوں میں واقع ہے بلکہ خود مغربی تہذیب کے عین قلب میں اب مسلمانوں کی

قابل ذکر آبادی وجود میں آ گئی ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ ہم مسلمان صرف تیل اور دوسرے فطری وسائل سے مالا مال نہیں بلکہ خدا کی آخری اور غیر محرف کتاب بھی ہمارے ہی درمیان موجود ہے۔ جزیرۃ العرب میں تیل کی یہ دولت ایک بڑی خدائی اسکیم کا حصہ ہے یہ ایک بڑی وقیع امانت ہے جو اللہ نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں دی ہے جن پر آخری لمحے تک اقوام عالم کی قیادت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ قرآن خدا کے بے پایاں فضل کا احساس دلاتے ہوئے ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم انسان اور کائنات کے توازن کو درہم برہم نہ ہونے دیں:

﴿ الرَّحْمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْءَ انَ Oخَلَقَ الْإِ نسٰن O عَلَّمَهُ الْبَيَان O الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ Oوَ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدَانِ O وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ O أَلَّا تَطْغَوْافِى الْمِيْزَان O وَأَقِيْمُواْ الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُو الْمِيْزَانَ ﴾

قرآنی تصور حیات میں میزان محض عدل کی علامت نہیں بلکہ ایک ایسے ہمہ گیر توازن پر دال ہے جس کا درہم برہم ہونا دنیا وآخرت کو تباہ وبرباد کرسکتا ہے۔ اگلی آیات ہمیں بار بار مختلف انداز سے خدا کی بے پایاں نعمتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں جو اس سرزمین پر، دریاؤں میں اور فضاؤں میں انسانوں کے لیے مسخر کی گئی ہیں۔ ﴿ فبای آلاء ربکماتکذبان ﴾ کی دلکش تکرار ہم سے بار بار یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اس فطری توازن یا balance کو تہہ وبالا نہ ہونے دیں۔ بلاشبہ دنیا ہمارے لیے مسخر کی گئی ہے لیکن فطری وسائل کا زیاں یا دوسروں کو اس سے محروم کرنا انسان اور فطرت کے مابین خوشگوار رشتوں کا قاطع ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں فرد کے لیے زندگی کا لطف جاتا رہے گا۔ دنیا میں سیاروں کی اپنے مدار پر گردش ایک نظام کے تابع ہے اور یہاں ہر روز ایک نئے جلوہ کا ظہور ہے: ﴿کل یوم ھو فی شأن ﴾۔ انسانوں کے لیے لازم ہے کہ خدا کی ان عنایات سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ خود کو اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ وہ اس توازن سے، جو اس کائنات میں قائم ہے، چھیڑ چھاڑ کے بجائے ایک امین کے طور پر اسے برتے۔ اگر انسان فطرت سے لطف وکرم کا معاملہ رکھے اور اسے عالم محسوسات میں اپنے تفویض کردہ رول کا احساس ہو تو دنیا اس کے لیے جنت ارضی کا منظر پیش کرنے لگے یہ اس جنت کے علاوہ ہے جس کا وعدہ اللہ نے اہل میزان یا عدل والوں سے کر رکھا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں دوجنتوں کی بشارت دی گئی ہے۔ ﴿ ولمن خاف مقام ربه جنتان ﴾۔

آخری کتاب کے حاملین اور تیل کی عظیم دولت کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیل اور تبلیغ گویا مستقبل کی کلید ہے۔ اگر ہم تیل کی نکاسی بند کردیں تو چشم زدن میں موجودہ تہذیب زمین بوس ہوجائے۔ جب سے ہم نے تبلیغ کی ذمہ داریوں سے منھ موڑا اور قرآن مجید کے مقابلے میں اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیرات کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تب سے نہ صرف ہمارا بلکہ پوری دنیا کا رشتہ خدا کی کتاب سے منقطع ہوگیا۔ دنیا بے سمتی کا شکار ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اور فطرت کے مابین نازک توازن برقرار نہ رہ سکا۔ آج ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہاں ماحولیاتی آلودگی، صاف ستھری ہوا قابلِ شُرب پانی کے فقدان جیسے بنیادی مسائل کی ہر طرف گونج سنائی دے رہی ہے۔ امارت اور غربت کی خلیج میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ٹیکس کے جبری نظام میں فرد کی آزادی یکسر ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ کوئی ایسی جائے پناہ نہیں جہاں انسان اس نظامِ جبر سے باہر آزادی کی چند سانس لے سکے۔ چاہیں یا نہ چاہیں ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ مہمل دفاعی منصوبوں کے لیے اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ نظام جبر کے حوالے کرتے رہیں۔ تیل کی دولت جب سے سرمایہ داروں کے ہاتھ لگی ہے انسان پر انسانوں کا ظلم مسلسل بڑھتا جارہا ہے۔ انسانی تاریخ میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ انسان نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے قتل اور تباہی کے لیے اتنے خطرناک اور مؤثر اسلحے ایجاد کئے ہوں اور انسانوں کے قتل کو حادثاتی موت یا collateral damage کا نام دیا ہو۔

تیل کی یہ تہذیب جس طرح مغرب میں پروان چڑھی ہے اس نے ہمارے لیے مستقبل کے حوالے سے سخت اندیشے پیدا کردیئے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ سیاسی نظام پر سرمایہ داروں کی گرفت نے تبدیلی کے امکانات پر ممکنہ پہرے بٹھادیئے ہیں۔ اس بے سمت تہذیب کو مزید قوت فراہم کرنے کے لیے کیا ہم اسی طرح تیل کی رسد جاری رکھیں اور اس طرح بالواسطہ طور پر اس نظام جبر کو غذا فراہم کرتے رہیں یا مسلمان کی حیثیت سے ہمارا کچھ مختلف رول ہونا چاہیے؟ خدا کے آخری پیغام اور تیل کی عظیم دولت کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر آنے والی نسلوں کے حوالے سے بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو ابھی دنیا میں نہیں آئے ہیں کیا ان کا یہ حق نہیں کہ وہ ایک صحت مند فضا میں آنکھیں کھولیں۔ گلوبلائزیشن کے نام پر تیل کا اندھا دھند استعمال سیاسی، عقلی اور اخلاقی ہر اعتبار سے ایک جرم عظیم سے کم نہیں۔ آخر اس بات کا عقلی جواز کیا ہے کہ کھانے کا ایک پیکٹ اور پانی کی ایک بوتل ہماری میز تک پہنچنے سے پہلے ہزاروں کیلومیٹر کا سفر کرے یا ہم اپنی رہائش گاہوں سے دفتر تک ہر روز دو تین گھنٹے آمد ورفت

میں ضائع کریں۔ بھلا یہ کیسی عقلمندی ہے کہ پانی کی ایک بوتل جو ہمالیہ کے دامن میں بھری جاتی ہو ہزاروں کلو میٹر دور چنئی اور ممبئی کے صارفین کو دستیاب ہو یا دارجلنگ کی چائے پہلے برطانیہ اکسپورٹ ہو اور پھر وہاں سے دنیا بھر میں اور خود ہندوستان میں دوبارہ امپورٹ کی جائے۔ تیل کے ناعاقبت اندیشانہ استعمال نے مختلف ملکوں کے مابین ایسی تجارت کو فروغ دیا ہے جس میں بیچنے والا وہی چیز خرید بھی رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہالینڈ اور انگلینڈ باہم ایک دوسرے کو گوشت اور دودھ مکھن جیسی اشیاء بیک وقت بیچتے اور خریدتے رہتے ہیں اور ایسا کرنے میں یہ ممالک تنہا نہیں ہیں۔ آزاد منڈی کی تجارت میں یہ سب کچھ معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ جب ہم سپر مارکٹ میں مختلف ملکوں کے بنے ہوئے پنیر کے پیکٹ یا دوسری اشیائے صرف کی مختلف مصنوعات دیکھتے ہیں تو ہم اسے گلوبلائزیشن کی برکتوں سے تعبیر کرتے ہیں لیکن در حقیقت اس کے پیچھے تیل جیسی عظیم نعمت کا ناعاقبت اندیشانہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک طرح کا پاگل پن ہے جس پر سرمایہ داروں نے خوش کن اصطلاحات کا لبادہ ڈال رکھا ہے۔

ایک نئی تہذیب کی ضرورت

تیل تو پھر بھی ایک قیمتی شئے ہے نبی کریمؐ نے تو ہمیں پانی جیسی کثرت سے پائی جانے والی شئے کو بھی حزم واحتیاط سے استعمال کرنے کی تاکید کی ہے۔ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کے سلسلے میں اگر انسان تشکر کے جذبات سے لبریز ہو تو یقیناً وہ ان نعمتوں کو برتنے میں کسر نفسی اور حزم واحتیاط کا مظاہرہ کرے گا اور اگر دل ودماغ اس شعور سے خالی ہوں تو فطری وسائل کی طرف اس کا رویہ کبر ونخوت پر محمول ہوگا۔ ہم کوئی نصف صدی سے اس احساس نخوت کے سایے تلے جیتے رہے ہیں کہ اگر تیل ختم ہو گیا تو کوئی دوسرا متبادل وجود میں آجائے گا لیکن اب تک کسی عملی متبادل کا حصول ہمارے لیے ممکن نہ ہوسکا۔ اس سے پہلے کہ تیل کے بقیہ ماندے کنویں خشک ہو جائیں تیل کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ ہم دنیا کو ایک متوازن طریقۂ زندگی پر آمادہ کریں۔ وہ تمام لوگ خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں جو اس مسئلہ کا کسی قدر ادراک رکھتے ہیں انہیں اپنا شریک وسہیم بنانے میں ہمیں کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم عام انسانوں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کریں کہ اگر خدا کی اس عظیم نعمت کو اسی طرح غیر منصوبہ بند طریقے سے ضائع کیا جاتا رہا تو تہذیب کا یہ جاہ وحشم چند برسوں میں ہوا ہو جائے گا۔ اگر دنیا کو آنے والے بحران سے بچانا ہے تو ہمیں اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہوگا، گویا ہمیں تہذیب کا ڈھانچہ از

سرِنو تشکیل دینا ہوگا۔ اس کے بغیر اب بات بننے کی نہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب ترقی کے سرمایہ دارانہ ماڈل نے دل و دماغ کو مسحور کر رکھا ہو، جب اقوامِ عالم کے مابین فلک بوس عمارتوں اور بلند و بالا ٹاوروں کی دوڑ چل نکلی ہو، ایک نئی تہذیب کی دعوت یا متبادل طرزِ زندگی کا قیام کچھ آسان نہ ہوگا۔ گذشتہ دنوں کویت سے ایک خبر آئی تھی کہ وہاں ایک ہزار ایک میٹر بلند الف لیلائی ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ ادھر جدہ میں پرنس ولید ایک میل اونچے ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ بنارہے ہیں جس پر دس بلین ڈالر کے صرفے کا تخمینہ ہے۔ برج دبئ جو اس وقت دنیا کی بلندترین عمارت ہے اسے یہ اندیشہ ستائے دیتا ہے کہ اسے البرج کے نام سے ایک نئے رقیبانہ منصوبے کا سامنا ہے۔ جب تک سرمایہ دارانہ تہذیب کا سکہ چلتا رہے گا اور ہم تہذیب کو بلند و بالا ٹاوروں اور فلش ٹوائلٹ کے پیمانوں سے ناپتے رہیں گے ہمارے لیے ایک متبادل تہذیب یا طرزِ زندگی کا قیام ممکن نہ ہوسکے گا۔

۱۵

ایک نئے عہدِ ظلمت کی دستک

گذشتہ تین صدیوں سے مغرب ایک طرح کے فریب نظر کا شکار ہے بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فکری آزادی نے مغرب کا ذہنی افق منور کر رکھا ہے لیکن فی الواقع ایسا ہے نہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب کانٹ نے مغرب میں حریت فکر ونظر کا علم بلند کیا تھا اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ایک ایسے عہد میں سانس لے رہا ہے جب روشنی کی تلاش کا عمومی احساس پیدا ہو چلا ہے البتہ اس عہد کو ابھی عہدِ تنویر یا روشن یافتہ عہد (Enlightened Age) نہیں کہا جا سکتا۔ تب مغرب میں امید کی لَے بہت تیز تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانی دل ودماغ جو مدت سے غور وفکر کی لذت سے ناآشنا تھے، اب اعتماد کے نئے جلووں کی آماجگاہ ہیں۔ کانٹ کے بقول انسانی ذہن نے اپنے اوپر یہ پابندی خود عائد کی تھی کہ وہ پچھلوں کے مقابلے میں تحلیل وتجزیئے اور غور وفکر کا متحمل نہیں رہ گیا ہے۔ جب ایک بار اس واہمہ کے غبارے سے ہوا نکل گئی تو ایک عقلی رویے کی تشکیل کی راہ ہموار ہو گئی جو گویا اس بات کی ضمانت تھی کہ آنے والے دنوں میں اس عقلی رویے کے ذریعے ایک نئی مثالی تہذیب کی داغ وبیل رکھی جا سکے گی۔ مغرب میں Enlightenment کے بعد، آنے والے دنوں میں، ایک عقلی انسان کی تشکیل کا کام زور وشور سے جاری رہا۔ ابتداً تو ایسا محسوس ہوا کہ انسانی عقل ایک متبادل دنیا کی تزئین وترتیب کا کام انجام دے سکتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بطن سے جمہوریت کا ظہور، ان براعظموں کی دریافت جن کے تذکرے

سے بائبل کے صفحات خالی تھے، یا بائبل کے تصور کائنات کے برخلاف ایک ایسی دنیا کی دریافت جہاں زمین جامد نہ ہو بلکہ کائنات ہر آن آگے بڑھ رہی ہو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئی ٹیکنالوجی کی ایجاد سے انسان کے قوتِ کار اور اس کے اختیار میں اضافہ، یہ سب کچھ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس نے عقلی انسان کو خود اعتمادی سے متصف کیا۔ یہ خیال کہ آنے والے دنوں میں کائنات کی شاہِ کلید اب انسانوں کے ہاتھ میں ہوگی، اور یہ کہ نئی دنیا کی تعمیر کے لیے عقل پر انحصار کافی ہے افسوس کہ بہت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں انسانی توقعات پر مایوسی کی دھند دبیز ہوتی گئی۔ ابتداً جو یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ خدا کائنات کی تخلیق کے بعد لاتعلق ہوگیا ہے اب اس خیال نے آگے چل کر دہریت کے فلسفے کو وجود بخشا۔ مغرب کا ذہنی افق بہت جلد نہل ازم، اسٹرکچرلزم اور ایگزسٹینشیلزم جیسے قنوطی نظریات کی آماجگاہ بن گیا۔ دو عظیم جنگوں کی تباہی اور اوشوٹس کی تجربہ گاہ میں نازیوں کی بربریت نے فطرتِ انسانی کے بارے میں ہلا مارنے والی قنوطیت کو جنم دیا۔ یہ اسی عمل کا تسلسل ہے کہ آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں جب امریکی استعمار نے پوری دنیا پر دہشت کی جنگ تھوپی ہے، صاف محسوس ہوتا ہے کہ مغرب میں روشنی کا ظہور محض ایک واہمہ تھا۔ جن لوگوں نے گذشتہ تین سو سالوں میں تہذیب کی قیادت کی ہے وہ بالآخر ہمیں ایک ایسی تاریک گلی میں لے آئے ہیں، جہاں آگے راستہ مسدود ہے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ تو کیا ایک نیا عہد ظلمت ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے؟

مغرب میں حریتِ فکر کی تحریک جس طرح آگے بڑھی اس میں ایک بنیادی نقص تھا۔ خدا کو دیس نکالا دے کر انسان نے اپنے اوپر ڈھیر ساری ذمہ داری عائد کرلی تھی۔ مروجہ مذاہب کے محاکمہ کے بجائے اسے یکسر رد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی عقل کے لیے ٹیک لگانے کو کوئی بنیاد نہ رہی۔

ایک ایسی دنیا میں، جہاں خالق تخلیق کے بعد پس پردہ چلا گیا ہو، جیسا کہ حریت افکار کے ابتدائی علمبرداروں کا خیال تھا، انسانوں کے لیے کائنات میں اپنے مقام کا صحیح تعین اور معنویت کی تلاش مشکل ہوگئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ حریت افکار کی اس تحریک نے فکر انسانی پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ مغرب میں ہمیشہ ہمیش کے لیے غور وفکر کا انداز بدل گیا۔ ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ البتہ یہ احساس ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا رہا کہ جیسے زندگی میں کہیں کچھ خلاء رہ گیا ہو۔ اس پُر ہیبت کائنات میں چھوٹے سے انسان کی بساط ہی کیا ہوسکتی تھی جسے اب سب کچھ خود آپ ہی انجام دینا تھا اور اس عمل میں اسے عقل کے علاوہ کسی

اور سہارے کی امید نہ تھی۔ شاید انسان اتنے بڑے بوجھ کا متحمل نہ تھا۔ نیٹشے نے ایک خیالی دیومالائی انسان Übermensch کی ضرورت محسوس کی اور اس طرح بات بالآخر وہیں پہنچی کہ انسانوں کی نجات کے لیے کوئی دیومالائی مسیحا پردۂ غیب سے ظاہر ہو۔ گو کہ عیسائی یا یہودی مسیحا کے بالمقابل نیٹشے کے دیومالائی انسان کو اسی سرزمین پر تخلیق کیا جانا تھا لیکن ان باتوں سے کم از کم یہ احساس تو ضرور پیدا ہوا کہ محض عام گوشت پوست کے انسان کے بس میں نہیں کہ وہ جدید دنیا کا چیلنج قبول کر سکے۔

ڈیسکارٹ نے جب بانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ میں چونکہ سوچتا ہوں اس لیے میرا وجود ثابت شدہ ہے (*cogito ergo sum*) تو وہ دراصل انسانی زاویۂ فکر میں ایک بڑی تبدیلی کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ آنے والے دنوں میں انسانی تہذیب خدا کے بجائے انسان کے گرد گردش کرے گی اور اس کی تقدیس کا نغمہ گائے گی۔ گویا مستقبل میں علم صرف اسے کہا جا سکے گا جس کی صداقت انسانی حواس کے ذریعے ہو سکتی ہو۔ انسان کو خدا کے مقام پر لا بٹھانا نئی تہذیب کی تاراجی کا سبب بن گیا۔ عقل پر کلی انحصار کے سبب اب انسانی بصیرت نام تھا a priori اور posteriory کے مجموعے کا۔ وحی اور وجدان کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ انسان خود اپنا پیمانہ تھا۔ وہی عبد بھی تھا اور معبود بھی۔ اس صورت حال نے ایک نئی مذہبی حسیت کو جنم دیا جسے Humanism بمعنیٰ انسان دوستی یا کسی حد تک انسان پرستی کا نام دیا گیا اور جس کی بنیاد پر جمہوریت کا سیاسی فلسفہ تراشا گیا۔

لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کوئی متعین یا غیر متبدل قدر اور پیمانہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کو بنیاد بنا کر جو فلسفۂ زندگی تعمیر کیا گیا اسے ثبات مشکل تھا۔ جمہوریت انسانی توقعات پر کبھی پوری نہیں اتری۔ مختلف ادوار میں اس کے معانی بدلتے رہے۔ کبھی اسے نوآبادیاتی نظام کی خدمت پر مامور کیا گیا تو کبھی اس نے انسانی قتل عام کو جواز بخشا اور کبھی جمہوری نظام کی کوکھ سے عوامی تباہی کے ہتھیار اور ایٹم بم برآمد ہوئے۔ فی زمانہ جب یہ احساس عام ہے کہ ہم مابعد جدیدیت کے عہد میں تاریخ کی آخری شام کے جھٹپٹے سے دوچار ہیں، زندگی کا وقوعہ ختم ہو چکا ہے، ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہمارے حواس میں سرایت کر گئی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روحانی زندگی کا رمق ہمارے وجود سے رخصت ہو گیا ہے، ایسا لگتا ہے گویا ہر لحہ ہمارے اندرون میں ایک اجنبی وحشی پروان چڑھ رہا ہو۔ مغرب میں خدا کی موت کا اعلان بالآخر انسان کی اپنی موت پر منتج ہوا۔ انسان کے اندرون میں انسان نے دم توڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں

جمہوریت اور فسطائیت ایک ہی چیز کے دو نام سمجھے جاتے ہیں۔ جمہوریت نے اپنے طویل سفر میں سرمایہ داروں کی بھرپور معاونت کی ۔ اسی کے سہارے مختلف جمہوریتوں میں موروثی خاندانی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ کبھی اس نے فوجی آمروں کو جواز فراہم کیا تو کبھی کھلی فسطائیت جمہوری تماشے کا حصہ سمجھی گئی۔ یہ تمام نظریئے بنیادی طور پر انسان کی تقدیس سے عبارت تھے۔

توقع تھی کہ حریت فکر کی تحریک انسان کو جھوٹے خداؤں اور توہمات سے نجات دلائے گی، لیکن عملاً ہوا یہ کہ توہمات کی گرم بازاری تو اسی طرح قائم رہی البتہ انسانوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیدا کردہ نئے عذاب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ گذشتہ تین صدیوں میں عقل وخرد کے مارے انسانوں نے انسانوں پر جو ظلم روا رکھا ہے جس کی ایک جھلک صنعتی انقلاب سے لیکر عصر حاضر میں برپا ہونے والی تیل کی جنگوں میں دیکھا جاسکتا ہے، اور جسے مہذب قومیں ''دہشت کے خلاف جنگ'' جیسی اصطلاحوں میں چھپاتی ہیں اس خیال کی تصدیق کے لیے کافی ہے کہ اوشوٹس، ہیروشیما، گوانتانا مو اور ابوغریب میں جو کچھ ہوا وہ محض حادثاتی امر نہ تھا بلکہ اس فکری رویے کا منطقی لازمہ تھا۔ آج ایک بار پھر دنیا کو فریڈرک نیٹشے کے فسطائی عزائم سے سابقہ ہے جس نے اپنے فکری مغ بچّہ دریدہ کے ذریعے عصر حاضر کو ایک تلاطم سے دوچار کر رکھا ہے۔ نیٹشے کا دیو مالائی انسان (Übermensch) جسے اس کی تصوراتی دنیا میں کلیدی حیثیت حاصل ہے کمزوروں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔ نیٹشے نہ صرف یہ کہ نازی جرمنی میں سرکاری فلسفی کی حیثیت سے دیکھے گئے بلکہ مسولنی جیسے لوگ بھی ان کی تحریروں سے فکری غذا حاصل کرتے تھے۔ اور اب جو لوگ خود کو مابعد جدیدیت کا علمبردار کہتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی نیٹشے کو فکری پیشوا کی حیثیت حاصل ہے۔ دریدہ، فوکو، ڈیلیوز یہ سب کے سب فکری طور پر نیٹشے کے شاگرد ہیں اور ان کے دل ودماغ پر حسن، اخلاق اور سچائی کے سلسلے میں نیٹشے کی ہلا مارنے والی بےمعنویت Nihilism) کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ ان تلامذہ کو معانی کی تحریف وتبدیلی میں جو غیر معمولی کامیابی ملی ہے یا اگر یہ ہمیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ معانی متن سے رخصت ہوسکتی ہے اور پھر بھی ان کا یہ خیال کو متن کے باہر کچھ بھی نہیں ہے *il n'y a pas de*) (*hors-texte* انسانی فکر پر اب تک کا سب سے خطرناک حملہ ہے۔ اس طرز فکر نے زبان کے سلسلے میں ہمارے تصورات کو بڑی حد تک منہدم کر دیا ہے ۔ اگر زبان کے بنیادی فریضے کے سلسلے میں شبہات وارد ہو جائیں تو پھر غور وفکر اور فلسفیانہ مباحث کا اعتبار کیسے قائم رہ سکے گا؟

انسانی عقل کے سہارے خوابوں کی ایک نئی دنیا تعبیر ہوسکی اور نہ ہی کانٹ کا متوقع عہد پرُنور (Enlightened Age) ہمارے تجربے کا حصہ بن سکا۔ البتہ اس کے برعکس یہ ضرور ہوا کہ آج ہم ایک ایسی صورتحال سے دو چار ہیں جسے دریدہ جیسے لوگ logo-centrism یا عقلی نظام جبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ حریت فکری کی تحریک جب ایک بار بے سمتی کا شکار ہوگئی تو انسانی معاشرہ کا بحران میں مبتلا ہونا فطری تھا۔ یہ جو ہر طرف آج ڈی کنسٹرکشن کا غلغلہ بلند ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اب اقدار کو ثبات نہیں اور اس نظری سناٹے میں معانی کی دریافت مشکل ہے۔ مثال کے طور پر دریدہ جب یہ کہتا ہے کہ مسلّمات خواہ وہ اخلاقی ہوں، دستوری ہوں یا قانونی ان کے بس کا نہیں کہ وہ تمام مخصوص صورت حال میں یکساں انصاف کے قیام کی ضمانت دے سکیں تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ انفرادی آزادی کی وکالت کررہے ہوں۔ لیکن اس کے مضمرات پر غور کیجئے تو دراصل یہ زاویۂ فکر ہمارے مستحکم اقدار کی چولیں ہلا رہا ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی طرزِ فکر نے صدر بش کی سیاسی وجودیت کو جواز فراہم کیا ہے۔ اگر کوئی اخلاقی اصول یا دستوری ضوابط قیام انصاف کے لیے قطعاً مہمل ہے اور اگر کوئی انتہائی غیر اخلاقی سیاسی فیصلہ بھی انسانوں کے لیے اتنا ہی منفعت بخش ہوسکتا ہے جتنا کہ کوئی سوچی سمجھی اخلاقی رائے تو پھر اوٹشوٹس، ابو غریب اور گوانتا ناموں میں جو کچھ ہوا اسے قابلِ نفریں قرار دینے کا جواز کیا ہوگا؟

مغرب میں حریتِ فکرِ انسانی کی تحریک جس بے سمتی کا شکار ہوئی اس کے منطقی ثمرات اب دیکھنے کو مل رہے ہیں جب یہ احساس عام ہے کہ بند تاریک گلی میں آگے راستہ مسدود ہے۔ بعض اسے تاریخ کے خاتمے سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ نظری خلاء کا یہ عہد دراصل تہذیب کا وقتی گہن ہے۔ البتہ جو لوگ صورت حال کا کسی قدر ادراک رکھتے ہیں وہ اس صورت حال میں صرف پریشان ہی نہیں بلکہ خود کو بے بس بھی محسوس کرتے ہیں سرمایہ داروں کے جمہوری تماشے نے دنیا کو چند بڑے تاجروں کی مٹھی میں دے دیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے سخت شکنجوں میں فرد کی حیثیت ماہیٔ بے آب کی ہے۔ ذرائع ابلاغ نے ہماری بصیرت پر دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔ ہمیں وہی کچھ نظر آتا ہے جو ان کا کیمرہ دکھانا چاہتا ہے۔ فطری وسائل کے بے محابا استعمال پر روک لگانے کے لیے کوئی موثر قوت نہیں رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلحوں کی دوڑ اور ماحولیات کی مسلسل تباہی رفتہ رفتہ اس کرۂ ارض پر زندگی کے امکانات معدوم کرتی جارہی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی شب ظلمت اب ہم پر سایہ فگن ہونے کو ہے۔

جدید مغرب میں اب ایسی کوئی مسلمہ قدر نہیں رہ گئی ہے جس کی بنیاد پر نیک وبد کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اگر ایک طرف ہم خود کو ان خوش قسمتوں میں سمجھتے ہیں جنہیں طب وصحت کی جدید سہولتوں نے طویل العمری عطا کی ہے۔ سفر کی سہولتوں نے ہمارے لیے جلوۂ کائنات کے مواقع فراہم کیے ہیں، کوہ ودشت کی وسعت اور فضاؤں کی بلندی ہمارے تصرف میں آ گئی ہے، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے ہمیں جامِ جمشید کا لطف عطا کیا ہے تو دوسری طرف بے لطف، یکسانیت کی ماری، خالی خولی زندگیاں ہر لمحہ ہم سے سوالی ہیں کہ آخر اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا ہے؟ آخر وہ کیا چیز ہے جو کھوئی گئی ہے جس کے بغیر زندگی بے لطف ہے۔ وہ مسرت آمیز زندگی، وہ طرب انگیز لمحے جب محض جیئے جانا بھی ایک لطف تھا آخر کہاں رخصت ہوگئے۔ صورت حال کے تدارک کے لیے مشرق ومغرب میں ایسے روحانی اداروں اور صوفی منشوں کا ایک سیلاب سا آ گیا ہے جو خالی خولی زندگی کو مسرت سے ہم آہنگ کرنے کی ضمانت دے رہے ہیں۔ مغرب میں گذشتہ چند برسوں میں یہودی تصوف کے علمبردار قبالائی مراکز کو خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ بعض ایسے فرقے بھی وجود میں آئے ہیں جو غم کے ماروں کو جنت میں راست داخلے کی بشارت سناتے رہے ہیں۔ بہت سے لوگ خودکش اشیاء کے استعمال کے ذریعے عازمین جنت میں شامل ہو چکے ہیں اور بہت سے ابھی اس بارے میں شش وپنج میں مبتلا ہیں۔ تو کیا جدید مغربی معاشرہ، جس کا مشرق بھی کسی قدر لاحقہ بنتا جارہا ہے ایک عمومی خودکشی کی صورت حال سے دوچار ہے؟

اڈورنوا اور ہارکیمر کی اس بات میں محض جزوی صداقت ہے کہ عقل بذاتِ خود بے عقلی کے راستے پر چل نکلی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت حال جتنی دھماکہ خیز ہے اس پر قابو پانا تنہا بے چاری عقل کی بساط سے باہر ہے۔ جب صورت حال ایسی دھماکہ خیز ہو تو انسانی عقل کے لیے حواس کھو دینا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے جب انسان معجزات وکرشمات سے دادرسی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کاش بیٹھے بیٹھائے کوئی معجزہ ہوجائے۔ ایک خالص غیر عقلی رویہ اس کی امیدوں کا واحد سہارا رہ جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتداء میں بدقسمتی سے ہم خود کو ایک ایسی ہی صورت حال میں گھرا پاتے ہیں۔ آیئے ان امور کا قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔

ناعقل پسندی

حریتِ فکر کی تحریک شروع تو اس دعوے سے ہوئی تھی کہ وہ انسان کو اپنی ہی عائد کردہ احساس

کمتری سے نجات دلائے گی۔ فرد اپنے امور کا مختارِ کل ہوگا،اسے کسی شیخ یا پیر کلیسا کا دامن تھامنے کی ضرورت نہ ہوگی۔لیکن آج جب اس تحریک کو کوئی تین سو برس ہونے کو آئے ہیں اس کے بطن سے جو کچھ برآمد ہو رہا ہے وہ انتہائی مایوس کن ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسانوں کی ایک قابل ذکر تعداد آج سکون کی تلاش میں اشتہاری عاملوں اور نیم خواندہ روحانیوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ عہد جدید کے یہ عامل خود کو لائف اسٹائل گُرُو اور ماہرینِ لطف و انبساط کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ کسی کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ اس نے عہدِ جدید کے خود سر بچوں کو قابو میں رکھنے کا فن دریافت کرلیا ہے تو کوئی اس بات کا دعویدار کہ وہ آپ کی روحانی اور نفسیاتی الجھنوں کا مداوا کرسکتا ہے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو کہنے کو تو نئ اصطلاحوں میں کامیاب خوشگوار زندگی کے معلمین ہیں لیکن فی الواقع ان کی حیثیت اس عہد بے عقلی کے شیوخ کی ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو ان حضرات کے تصرف سے بچارہ گیا ہو۔ مقبول عام کتابوں کا ایک امنڈتا سیلاب ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کی سیر کیسے کریں، چیزوں کو کیسے دیکھیں، سوچنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے احساسات کو کس طرح ترتیب دیں۔ لباس کی تزئین وآرائش سے لے کر کتاب پڑھنے کے فن، دوست بنانے کا گُر، معشوق کو دامِ محبت میں گرفتار کرنے کا ہنر گویا ہر مسئلہ میں یہ آپ کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ بظاہر تو یہ آپ کو زندگی جینے کا فن (Art of Living) سکھاتے ہیں لیکن فی الواقع ان حضرات نے ہماری ناکامیوں، محرومیوں اور خوش عقیدگیوں کے طفیل خود کو زندہ رکھنے کا فن دریافت کرلیا ہے۔عہدِ جدید کے روحانی عاملین کا یہ کاروبار اب اربوں ڈالر کی ایک وسیع انڈسٹری بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں صرف ایک دیپک چوپڑا کی سالانہ آمدنی بیس ملین ڈالر تک جا پہنچی ہے۔ برطانیہ میں ذہنی الجھنوں سے نجات دلانے کی دعویدار ایک خاتون گینا ایکرس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ملاقات اور چند کلماتِ تسلی کے لیے دو ہزار پونڈ تک کی رقم وصول کر لیتی ہیں۔مغرب میں قبالائی مراکز کی گویا بہار سی آئی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی دولت مند عوامی شخصیتیں اور فلمی ستارے مثلاً میڈونا، الزابتھ ٹیلر، ایشٹن کوچر، بروٹنی اسپیئرس اور ڈینی مور وغیرہ ان مراکز کے مستقل گاہک ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قبالائی پانی مختلف امراض کے لیے اکسیر ہے اور یہ کہ قبالائی دھاگے کو ہاتھ پر باندھے رکھنے سے منفی اثرات اور نظر بد سے بچا جاسکتا ہے۔

محض ہالی وڈ کے ادا کار ہی اس دام فریب میں مبتلا نہیں ہیں۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے دار حتیٰ کہ

بعض ریاستوں کے صدور بھی کوئی اہم اقدام اٹھانے سے پہلے ان عاملینِ غیر صالحین کے ابرو اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن تو خیر اپنی توہم پسندی کے لیے خاصے معروف تھے۔ ان کے سرکاری کاموں کا گوشوارہ بھی نجومیوں کی ایماء سے مرتب کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں جنیوا مذاکرات کے موقع پر انہوں نے اپنے نجومی جان کوئگلی سے خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ وہ ستاروں کے زائچوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس موقع پر گورباچوف کس طرح پیش آئیں گے۔ کلنٹن اور ان کی اہلیہ کھلے عام روحانی عاملین کے رابطے میں رہے ہیں۔ ہالی وڈ کے معروف روحانی عامل میرن ویلینسن اور کامیاب زندگی کے پیرومرشد انٹونی رابنس اور اسٹیفن کووی جیسے لوگوں سے سابق امریکی صدر بل کلنٹن کے گہرے رابطے زبان زد خلائق رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ ہلیری کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جین ہوسٹن سے ضرور مشورہ کرتی ہیں جو اپنے آپ کو مقدس ماہر نفسیات کے طور پر پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور ان کی اہلیہ چیری کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۰۰۱ء میں میکسکو کے ایک تفریحی سفر کے دوران ان دونوں نے از سر نو پیدا ہونے کا لطف حاصل کیا۔ اس رسم کے مطابق پہلے وہ خوشبو سے بسے کیچڑ میں لت پت ہوگئے پھر ایک دوسرے پر پپیتے اور تربوز اچھالتے رہے یہاں تک کہ ان حضرات نے اپنے اندر ایک نئی شخصیت کے وجود کی دستک سنی۔ ہندوستان جو روحانی عاملین اور توہم پرستی کا روایتی گہوارہ ہے یہاں آج بھی آئے دن ایسے واقعات دن کی روشنی میں ہوتے رہتے ہیں جس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب نجومیوں نے سابق وزیر اعظم نرسمہا راؤ کے لیے یہ کہہ کر مشکل کھڑی کردی تھی کہ ان کے لیے سرکاری رہائش گاہ خالی کرنے کا مناسب وقت دس جون کی تاریخ ہے جب کہ نئے وزیر اعظم کو یہ بات بتائی گئی کہ چھ جون کو سرکاری رہائش گاہ میں ان کا داخلہ نیک شگون کی علامت ہے۔ توہم کے ماروں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ دونوں وزیر اعظم چند دنوں کے لیے ایک ہی مکان میں قیام پذیر رہیں تاکہ ستاروں کے اثرات بد سے بچا جاسکے۔ سفلی علوم جو عہد وسطیٰ میں لوگوں نے مسترد کردیئے تھے اب دوبارہ روحانی سکون اور متبادل طرز زندگی جیسے ناموں سے قبولیت عامہ حاصل کررہے ہیں۔

جب عقل کا چراغ گل ہوتا ہے تو توہم پسندی اپنی گرفت مضبوط کرلیتی ہے۔ آج عہد جدید کی مابعد الطبیعات کے نام پر کیا کچھ نہیں روا رکھا گیا ہے۔ سفلی علوم سے لے کر بھوت پریت کو قابو میں کرنے

کے طریقے اور شیطان پرستی سے لے کر فطرت پرستی کے وہ تمام مظاہر جن سے صالح طبیعت اِبا کرتی ہے نئے نئے ناموں سے بازار میں دستیاب ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نازیوں نے جس انداز سے دنیا برتنے کی کوشش کی اس کے پیچھے دراصل بعض توہمات تھے جسے انہوں نے عقیدے کی حیثیت دے رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ویولس برگ کے قلعہ میں جسے جرمن نازیوں کے صدر مقام کا درجہ حاصل تھا پابندی کے ساتھ بعض سفلی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ نازی اس خیال کے قائل تھے کہ دنیا میں آریائی نسل کو خاص امتیاز حاصل ہے جوان کے عقیدے کے مطابق اٹلانٹس سے اس وقت ہجرت کر گئی تھی جب تیسرا چاند تباہ ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے اٹلانٹس اور ہولی گریل کی تلاش میں خاصی توانائی صرف کی۔ نازیوں کی طرح عہد جدید کے سفلی ماہرین بھی نئی ٹکنالوجی کو اپنے اہداف کے لیے استعمال کرنے کے فن سے واقف ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ توہمات اور ٹکنالوجی کا یہ تعامل بڑے حادثات کو جنم نہ دے۔ شوکو اَسَہارا نے جب ٹوکیو کے سب وے میں زہریلی گیس کا حملہ کیا تو وہ دراصل اپنے خیال میں لوگوں کی نجات کے لیے کام کر رہا تھا اور اسی طرح فرقۂ بابِ جنت کے قائد مارشل اپیل وائٹ نے جب دو درجن لوگوں کو خودکشی پر آمادہ کیا تھا تو وہ بھی دراصل اس بے مزہ زندگی سے ایک خیالی سیارے پر ان کی ہجرت کا سامان کر رہے تھے اور ابھی حالیہ دنوں میں جب صدر بش نے عراق اور افغانستان پر حملے کے ذریعے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ بھی اس خیالِ فاسد میں گرفتار تھے کہ فی زمانہ خدا نے انہیں جمہوریت اور آزادی کے فروغ پر مامور کیا ہے۔ کیا ہماری تہذیب حادثات کے گرداب میں پھنس گئی ہے یا یہ سب کچھ محض ابتداء ہے ایک مکمل تباہی کی؟ کارل ساگن سے بہتر اس حقیقت سے نقاب کشائی کون کر سکتا ہے، لکھتے ہیں:

> جب میں اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے امریکہ کا تصور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ٹکنالوجی کی طاقت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جائے گی۔ عوامی مفاد کے علمبرداروں کے لیے مسائل کا ادراک ممکن نہ ہوگا۔ لوگ اپنا ایجنڈا خود طے کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں گے اور نہ ہی ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ برسرِ اقتدار طبقے پر موثر تنقید کر سکیں۔ جب لوگ پتھروں کی خاصیت پر یقین کرنے لگیں، اعداد وشمار کے زائچوں سے مستقبل بینی کا کام لیں، ہماری فہم وفراست مسلسل روبہ زوال ہوا ور ہمارے لیے حق اور ذاتی پسند میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہو تو سمجھنا چاہئے گویا ہم غیر محسوس طور پر توہمات اور تاریکی کے عہد میں پہونچ چکے ہیں۔
>
> *(The Demon-Haunted Worlds)*

توہّمات

توہمات غیر عقلی رویے کا منطقی لازمہ ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، یہ ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔ وطن عزیز ہندوستان میں اچانک دودھ کے معجزے کا غلغلہ بلند ہوا۔ دیکھتے دیکھتے تعلیم یافتہ اور روشن خیال مرد وزن کا انبوہ کثیر مندروں کے گرد جمع ہونے لگا۔افواہ گرم تھی کہ مٹی کے بت اچانک دودھ پینے لگے ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں پر سائنس دانوں کے مابین گھنٹوں یہ بحث چلتی رہی کہ لوگ جس فریب نظر اور پروپیگنڈے کا شکار ہیں وہ دراصل سطح آب کا تناؤ ہے۔ حیدرآباد جسے جدید ہندوستان میں انٹرنیٹ کے شہر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے وہاں جب ایک بار سورج گہن ہوا تو پڑھے لکھے، معقول لوگ محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں بھاگے پھرے۔ حاملہ عورتیں اس قدر خوفزدہ تھیں کہ انہوں نے بڑی بوڑھیوں کے اس مشورے کو بلاچوں چرا مان لینے میں عافیت جانی کہ اس دوران انہیں بدن کھجانے سے احتراز کرنا چاہیئے مبادا نومولود کے جسموں پر خراش آجائے۔

دنیا بھر میں توہم پرستی روز افزوں عروج پر ہے۔اس بات کا اندازہ اخبارات کے ان مقبول عام صفحات سے بھی ہوتا ہے جو خرافات وتوہمات کے لیے وقف ہوتے ہیں ۔مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ (horoscope) زائچہ نویسی یا فال معلوم کرنے میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے حالانکہ ان زائچوں کا نہ کوئی عقلی جواز ہے اور نہ ہی سائنس کے عہد میں اس ظلمت پسندی کے لیے کوئی گنجائش ہوسکتی ہے۔لیکن حال یہ ہے کہ ۱۹۸۴ء کے ایک سروے کے مطابق ٪۵۵ امریکی نوجوان علم نجوم کے قائل ہیں۔ کہنے کو تو یہودی اور عیسائی دونوں مذاہب علم نجوم کے سخت مخالف ہیں۔موسیٰ بن میمون نے علم نجوم کو علم کے بجائے ایک مرض سے تعبیر کیا ہے اور بقول مارٹن لوتھر علم نجوم دراصل شیطان کی ایجاد ہے لیکن عیسائیت اور یہودیت کے سخت موقف کے باوجود مستقبل شناسوں کا کاروبار عروج پر ہے۔

نظر بد سے حفاظت کے لیے تعویذ اور تغروں کی تجارت ایک بڑے کاروبار کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ ترکی میں تیار کردہ شیشے کے خوبصورت تغرے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ان توہمات پر صرف اقوامِ غیر کی اجارہ داری نہیں ۔عربوں کے یہاں نظر لگنا اور نظر بد سے بچنے کے مذہبی فارمولے اجنبی نہیں ہیں۔اہل مغرب جب کسی شخص کو مفلوک الحال، لاغر ونحیف دیکھتے ہیں تو بالعموم ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص کسی کی نظر بد کا شکار ہوگیا ہے۔امریکی معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آج بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آئینہ

توڑنا خطرناک بدشگونی ہے جو خاندان میں کسی شخص کی موت پر منتج ہوسکتی ہے۔ امریکی ملّاح جب سمندر میں اپنے جہازوں پر ہوتے ہیں تو وہ سیٹی بجانے سے احتراز کرتے ہیں مبادا ان کا سیٹی بجانا سمندر کی خوفناک لہروں کو مشتعل نہ کردے۔ امریکی معاشرے میں یہ مقولہ زبان زد عام ہے کہ سیٹی بجانے والی لڑکیاں اور کٹکٹاتی مرغیاں ہمیشہ انجام بد سے دو چار ہوتی ہیں۔ ہمارے عہد میں وہ توہمات بھی دوبارہ زندہ ہوگئے ہیں جو عرصہ ہوا بیتے دنوں کے ساتھ ہمارے حافظے سے محو ہوگئے تھے۔ مثال کے طور پر اصلاح پسند یہودیت نے دروازوں پر مذہبی علامتوں کی تنصیب یا شادی کے موقع پر شیشہ توڑنے کی رسم کو ترک کر دیا تھا لیکن اصلاح پسند یہودی مولویوں کی نئی نسل ان فرسودہ رسوم کو از سرنو زندہ کررہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دکھ بھری زندگی میں اس طرح کی رسمیں نفسیاتی سکون کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

مغرب میں تیرہ کا ہندسہ گویا توہمات کی معراج ہے۔ اس ہندسے سے لوگوں میں جتنا ڈر اور خوف پایا جاتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بہت سی جگہوں پر گنتی میں تیرہ کا ہندسہ قصداً چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اٹلی کے شہر فلورنس میں آپ کو بارہ کے بعد تیرہ نمبر کا گھر دیکھنے کو نہیں ملے گا کہ اہل فلورنس نے اس ہندسے کے اثرات بد سے بچنے کے لیے بارہ کے بعد ساڑھے بارہ کا ایک نیا ہندسہ ایجاد کررکھا ہے۔ اٹلی کی سرکاری لاٹری میں تیرہ کا ہندسہ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔ جدید شہروں میں جہاں کثیر منزلہ عمارتیں تیرہویں منزل کے بغیر نہیں بن سکتیں وہاں بارہویں کے بعد چودھویں منزل کو شمار کرنا معمول کی بات ہے۔ ہوائی جہازوں میں تیرہویں قطار نہیں پائی جاتی اور بعض ایر پورٹ گیٹ نمبر تیرہ کو اپنی اسکیم سے خارج رکھتے ہیں۔ عقل ودانش کے اس عہد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ناموں میں تیرہ حروف کا پایا جانا انہیں مسلسل مشکلات وحوادث سے دوچار رکھ سکتا ہے۔ ایسے روحانی عاملوں کی کمی نہیں جو تیرہ کے ستم رسیدوں کو مختلف ہجوں کے ساتھ نئے انداز سے نام لکھنے کی ترکیب بتاتے ہیں اور اس کے عوض وہ خاصی رقم بھی اینٹھ لیتے ہیں۔

عہدِ ظلمت کی واپسی

جمہوریت پر سرمایہ داروں کی گرفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانا نظامِ جبر نئے ناموں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوگیا۔ گذشتہ چند سالوں میں بالخصوص عراق اور افغانستان پر امریکی قبضے کے بعد دنیا بھر میں جنگ مخالف جو مظاہرے ہوئے ہیں اس سے کم از کم یہ بات تو پوری طرح منکشف ہوگئی ہے کہ جو لوگ سیاسی

اقتدار پر قابض ہیں وہ عوامی جذبات واحساسات کی نمائندگی قطعی نہیں کرتے۔ اس سلسلے کی ایک فتیج مثال ہندوستان میں گجرات کا حالیہ الکشن ہے جہاں جمہوریت کی دیوی نے نریندر مودی کے سر پر دوبارہ تاج شاہی رکھ دیا ہے حالاں کہ ۲۰۰۲ء میں مودی نے جتنے بڑے پیمانے پر انسانیت کے خلاف سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کیا وہ ہر خاص وعام کی معلومات کا حصہ ہے۔ ساری دنیا مودی کو لائق نفریں ٹھہراتی رہی لیکن جمہوریت کچھ ایسا تماشہ ہے کہ اس نے اتنے نمایاں مجرم کو قوت کی پناہ گاہ فراہم کردی۔ مغرب میں یہ احساس عام ہوتا جارہا ہے کہ جمہوریت کا عہدِ زریں رخصت ہو چکا اب اس کی حثیت ایک ایسے ادارے کی ہے جسے سرمایہ دار مجرم اپنی کمین گاہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ فی زمانہ جمہوریت کا مطلب اسی عہد ظلمت کی واپسی ہے جب اہل اقتدار خفیہ طریقے سے اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے بہیمانہ ہتھکنڈے استعمال کرتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں کوئی ۷۰۰ ایسی کمیں گاہیں ہیں جسے امریکی افواج نے قائم کر رکھا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ان کیمپوں میں انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ حتی کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ جن ملکوں میں یہ کیمپ واقع ہیں ان کی حکومتوں سے اس سلسلے میں امریکہ نے کیا معاہدہ کر رکھا ہے۔ جو ممالک نیوکلیائی قوت کے طور پر جانے جاتے ہیں ان کے عام شہری کو اس بات کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ اس ملک کے پاس کتنے نیوکلیائی اسلحے موجود ہیں یا یہ کہ ان کا ملک حیاتیاتی اور کیمیاوی ہتھیاروں سے مسلح ہے یا نہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد جمہوری نظام کی سرّیت پر مختلف نئے قوانین کے ذریعے مزید پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں پیٹر یاٹ ایکٹ اور برطانیہ میں دہشت گرد مخالف ایکٹ کے نفاذ کے بعد اب یہ معلوم کرنا پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کہ دفاعی وزارتوں کے زیر اہتمام ہمارے جمہوری حکمراں کیسے کیسے خطرناک منصوبے بنا رہے ہیں۔ صورت حال اتنی خراب ہوگئی ہے کہ ۲۰۰۶ء میں امریکی کانگریس نے باقاعدہ یہ تجویز منظور کی کہ امریکہ میں تعذیبی مراکز کے قیام کے لیے فنڈ فراہم کیا جائے۔

مغرب میں عہدِ ظلمت کی واپسی پر عمومی بے چینی پائی جاتی ہے لیکن جمہوری نظام کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ نہ تو یہاں حزب مخالف کا کچھ بس چلتا ہے اور نہ ہی عوامی بے چینی اصلاح احوال کے لیے مؤثر ہوسکتی ہے۔ جو لوگ اقتدار پر قابض ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ عوامی مظاہرے اور مخالفین کی شعلہ بیانیاں ان کے اقتدار کے لیے خطرہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ لہذا ایک بار جب کوئی شخص کرسیِ اقتدار پر قابض ہوگیا

تو اس نے جمہوری تماشے سے شخصی اقتدار کے استحکام کا خوب خوب کام لیا۔ مثال کے طور پر سابق امریکی صدر ابراہم لنکن کو لیجئے جن کے اقوال، جمہوریت کے معلم کی حیثیت سے، دانش گاہوں میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں انہوں نے اپنے دور میں پریس کی آزادی پر سخت قدغن لگائی۔ وڈرو ولسن اپنے جنگی عزائم کے سلسلے میں ناقدین کو قطعی برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے اور روزولٹ نے اپنے عہد میں جاپانی نژاد امریکی شہریوں پر گویا قیامت بپا کر رکھی تھی۔ اب رہے جارج واکر بش تو انہوں نے شہری حقوق کی گویا بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ نائب صدر ڈک چینی جنہیں سابق سی آئی اے سربراہ اسٹینڈس فیل ٹرنر نے بجا طور پر'' نائب صدر برائے تعذیب'' کے خطاب سے نوازا ہے، بیانگ دہل تعذیب وتشدد کو ایک اخلاقی طریقۂ کار کے طور پر قبول کر لینے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ جب ابوغریب جیل میں عراقی قیدیوں پر تعذیب وتشدد کے بہیمانہ واقعات دنیا کے علم میں آئے تو اس موقع پر نیویارک ٹائمس نے جو اداریہ لکھا وہ موجودہ عہد ظلمت کے سلسلے میں خاصا چشم کشا ہے:

> اس ہفتہ نائب صدر ڈک چینی نے ایک عجیب وغریب تجویز پیش کی۔ اب تک قیدیوں کی تعذیب کے سلسلے میں امریکی فوجیوں کی شمولیت اخلاقی اور قانونی طور پر مخمصے کا سبب رہی ہے۔ اس مخمصے سے بچنے کے لیے بسا اوقات یہ قیدی اپنی اپنی حکومتوں کو لوٹا دیئے جاتے ہیں جو امریکی اشاروں پر تعذیب وتشدد کی کاروائی انجام دیتے ہیں۔ مسٹر چینی چاہتے ہیں کہ بجائے اس کے کوئی دوسرا ہمارے لیے یہ کام انجام دے سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی کو اس کام کا قانونی اختیار دے دیا جائے۔ (اداریہ اکتوبر ۲۶/ ۲۰۰۵ء)

تاریک خیالی

مذہبی علامتوں کے احیاء سے بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روحانی زندگی ایک بار پھر عود کر آئی ہے لیکن قریبی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ فی الواقع ہم ایک ایسے روحانی بیاباں میں رہنے پر مجبور ہیں جہاں روحانیت کے نام پر دراصل شیطان کی پرستش کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ٹیلی ویژن کے پردوں پر مذاہب کے علمبردار اپنے مختلف پروگراموں کے ذریعے اس بات کا یقین دلاتے رہتے ہیں کہ نئی ٹکنالوجی نے ایک پرمسرت روحانی زندگی جینے کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ عبادت گاہوں کے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہونے اور خصوصی مذہبی تقریبات میں شرکت کے

لیے اب ٹیلی ویژن کا آن کرنا کافی ہے۔ نئی اطلاعاتی ٹکنالوجی نے عہد جدید کے مبلغین کی ایک قابل ذکر فوج تیار کردی ہے جو عہد قدیم کے فرسودہ دلائل کو نئے عہد کی باز یافت کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ پیٹ روبرٹسن، جیری فیل ول اور آر البرٹ موہلر جیسے شہرت یافتہ مبلغین جو شب وروز یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ بائبل خدا کے الفاظ ہیں وہ شاید گذشتہ دو سو برسوں میں لکھی جانے والی بائبل کی علمی تنقید سے واقف نہیں۔ لیکن انہیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ پروپیگنڈہ کے اس دور میں جسے ٹکنالوجی کی سہولت حاصل ہے وہ اپنے کمزور موقف کو بھی حقیقت کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔ نئی ٹکنالوجی نے تقریباً تمام ہی ملکوں میں پرانی ساخت کے مبلغین کو نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ مغرب میں جہاں مذہبی زندگی کا خلا کچھ زیادہ محسوس کیا جاتا ہے نئے مبلغین کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ وہ عامۃ الناس کی ایک بڑی آبادی کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ انہیں خدا کا خصوصی قرب اور اعتماد حاصل ہے، وہ لوگوں کی الجھنوں اور پریشانیوں کا مداوا کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس تمام مسائل کا مقدس حل موجود ہے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ان خدمات کے عوض زیر کثیر خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے عہد ظلمت کی طرف پلٹ رہے ہوں جہاں ملامت اتارنے اور جن وآسیب سے محفوظ رکھنے کے لیے نذرانے کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی تھی۔

یہ ہے وہ روحانی دیوالیہ پن جسے ٹیلی ویژن مبلغین نے مذہب کا نام دے رکھا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ آسمانی کتابوں میں ہدایت کی تلاش کے بجائے ان مخفی رازوں کی نقاب کشائی کی کوشش کی جارہی ہے جن کا حصول ہمارے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوسکتا ہو۔ عیسائی نوجوانوں کی نئی نسل بائبل سے کہیں زیادہ اس کے مفروضہ رموز واشارات میں دلچسپی رکھتی ہے۔ خواب کی تعبیر، مستقبل گوئی، کائنات کی سرّیت سے آگاہی، حتیٰ کہ نوسٹرے ڈمس کی تحریریں یہ سب کچھ مذہبی لوگوں کی دلچسپی کا سامان بن گئے ہیں۔ اگر ایک طرف مشرق میں زائچوں کا استعمال، قرآن مجید کی مخصوص آیات کے ورد یا مخصوص اور اد ووظائف کو حل المشکلات کے طور پر استعمال کرنے کا رواج بڑھا ہے تو دوسری طرف مغرب میں اہل مذہب کی دلچسپی ان امور پر مرکوز ہوگئی ہے کہ جنوں کو کیسے تابع کیا جائے، ان کی حقیقت کیا ہے، وہ دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے کی طرف چلتے ہیں یا راست اوپر سے نیچے کی طرف ورود کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہ کتابیں ہیں جو بالغوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور ان کا شمار بچوں کی طلسماتی کہانیوں میں نہیں

ہوتا۔ غلو کا یہ عالم ہے کہ بعض لوگ نئے طبّی طریقۂ علاج سے تنگ آ کر بائبل کو متبادل کتاب طب کے طور پر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لوگوں میں ہر چیز کے سفلی حل کی طلب بڑھتی جارہی ہے۔ ان کتابوں میں جوئے روحانیت کے حوالے سے لکھی گئی ہیں ہر قسم کی واہیات وخرافات کو جگہ مل گئی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے مارک بوبیک کی ایک کتاب روحانی جنگ کی مبادیات (*Spritual Warfare Basics*) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب کے مطالعے سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نئے روحانیوں نے کس سج دھج کے ساتھ مذہب کا جنازہ نکالا ہے۔ مصنف اس گرہ کی عقدہ کشائی کرتا ہے کہ کس طرح خدا سے دعا کی جائے کہ وہ اس کے اعضائے مخصوص بشمول خون، ہڈی، بال، کھال حتیٰ کہ اس کے خلیے کو بھی شیطانی رسوم بجالانے کی توفیق دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خرافات کا بائبل سے کوئی تعلق نہیں لیکن مذہبی شائقین اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ مفید پاتے ہیں۔ ایسے لوگ جو خدا کے راست مشاہدے کے دعویدار ہوں مشرق میں شاید ان کے ظہور کا سلسلہ ختم ہوگیا ہو البتہ مغرب میں ہر آن ایسے مشاہدین حق کے ظہور کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کی دلچسپی کی خاطر ہم یہاں کیتھرین ریس کا مقبول عام روحانی نغمہ نقل کرتے ہیں جس کے بارے میں مصنفہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ نغمہ راست خدا سے حاصل کیا ہے:

اگر آپ خود کو بہت زیادہ سنجیدہ محسوس کرتے ہوں اور تقشّف نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہو
تو ہمارے پاس آپ کے لیے ایک مشورہ ہے۔
یہ قدرے غیر روایتی تجویز ہے مگر ہے دلچسپ
اگر لوگ آپ کو حواس باختہ بھی کہیں تو اسے برا مت مانئے
آیئے اس اجتماعی تفریح میں شامل ہو جایئے جو خدا نے ہمارے لیے برپا کی ہے۔
ہم آج اتنی خوشی منائیں گے کہ خدا ناشناسوں کو یہ پتہ چل جائے گا۔
کہ اہل کلیسا کو خدا نے سیر و تفریح میں کسی سے پیچھے نہیں رکھا ہے۔
جبریل امین نے ہمارے لئے ٹورانٹو کے اس جلوۂ عظیم کا اہتمام کیا ہے۔
میں پہلے سمجھتی تھی کہ زندگی محض بردباری کا نام ہے۔
حتیٰ کہ میں چیخ وپکار سے بھی احتراز کرتی اور یہ مجھ پر بہت شاق گذرتا

یہاں تک کہ روحِ خدائی نے میرے اندرون میں قہقہوں کی جوت جگا دی۔
اور اب میرا حال یہ ہے کہ میں جبریل امین کی پرداختہ ہوں، اپنے قابو سے باہر،
میری مثال اس انسان کی ہے جو خدا کی مستی میں سرشار ہو، اور اسی کی رسیا۔
میں مسیح کی آوارہ، اس کی چاہت کی تشنہ طلبی میں مبتلا،
اس عظیم روحانی شراب کی لذت کی ماری ہوں۔
بیا کہ جبریل امین ساقی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں،
اور میں مسلسل شرابِ روحانی کو منھ سے لگائے ہوئی ہوں۔

(Hank Hanegraaff, *Counterfeit Revival*, Dallas: World Publishing, 1997, pp.245-246)

یہ ہے وہ ظلمت پسند روحانیت جس کی ہر سو بہار آئی ہوئی ہے۔ ہے کوئی جوان نفسیاتی اور روحانی مریضوں کا علاج کرے۔ مغربی ذہن جو کبھی ہر شئے کی ماہیت کا متلاشی تھا، تحلیل وتجزے کے بعد رد وقبول کا رجحان رکھتا تھا آج مابعد جدید روحانیت کے زیر اثر اپنی حقیقت خود تخلیق کرنے کا داعی ہے۔ یہ اسی ظلمت پسندی اور محصور دماغی کا نتیجہ ہے کہ آج غور وفکر اور تحلیل وتجزیے کو جرم سمجھا جانے لگا ہے۔ ۲۰۰٦ء میں امریکی قوم کے نام خطاب میں جارج بش نے جو انداز اختیار کیا تھا وہ اس قبیل کی بہترین مثال ہے:

آج کی رات میں آپ کو ایک ایسے قانون کے اجراء پر آمادہ کرنا چاہتا ہوں جو طبی تحقیق کی بے سمتی روکنے کے لیے ہے۔ وہ مسائل ہیں انسانی کلوننگ اپنی تمام ہی شکلوں میں، مادۂ تولید کی تخلیق یا اس کی منتقلی، انسانوں اور جانوروں کی تخلیط اور مادہ تولید کی خرید وفروخت اور اس پر اجارہ داری۔

اس قسم کے تحکمانہ اور تنگ نظر اقدام سے کیا ایسا نہیں لگتا ہے کہ ہم ایک بار پھر اس عہدِ ظلمت میں واپس آ گئے ہوں جب عیسائی پیشواؤں نے گلیلو کو سائنسی تحقیق تجربے کے لیے قابلِ گردن زدنی قرار دیا تھا؟

مصیبت یہ ہے کہ جو لوگ اس بند دماغی کے مخالف ہیں وہ بھی ایک طرح کی انتہا پسندی کے شکار ہیں۔ وہ سائنس کو معروضی تجزیے کا موضوع بنانے کے بجائے اسے منصبِ خدائی پر فائز کر دیتے ہیں۔ وہ تعقل پسندی کے حامی تو ضرور ہیں البتہ وہ انسان کو مثلِ مشین سمجھتے ہیں اور اس کی تمام تر سریت سے اسے

محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ جدید سائنس سے اپنے تمام مسائل کے حل کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں مادۂ تولید کی ضروری اصلاح کے ذریعہ موروثی بیماریوں پر قابو پایا جا سکے گا۔ بہت سے پیچیدہ سماجی، نفسیاتی مسائل کے حل حتی کہ مجرموں کا سراغ لگانے میں بھی جینٹک کوڈ سے کام لیا جا سکے گا، جنین کی رپورٹ کی بنیاد پر شخص مذکور میں مخصوص صلاحیتوں کا پتہ لگانا ممکن ہو گا حتی کہ عالمِ سکرات کی ذہنی کیفیت کا مشینی زائچہ موت کی سریت سے بھی بہت سے پردے اٹھا دے گا۔ ابھی یہ کہنا شاید قبل از وقت ہو کہ ہم آنے والے دنوں میں نقص سے بڑی حد تک پاک انسان کی تخلیق کر سکیں گے یا نہیں البتہ اگر دنیا چہار ابعادی (Four Dimensional) ہے، جیسا کہ (Special Theory of Relativity) کے حاملین کا خیال ہے تو مستقبل پہلے سے موجود کہیں بھٹک رہا ہے۔ تو کیا ہم دائرے میں دوبارہ اسی مقام پر واپس آ گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آگے راستہ مسدود ہے۔ ہم ایک بار پھر اپنے آپ کو صدیوں پرانی اس بحث میں الجھا پاتے ہیں کہ انسان آزاد ہے یا فیصلے پہلے سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سائنس کی خدائی ہمیں اس ظلمتِ شب سے نجات دلا سکتی ہے اور نہ ہی ہیڈیگر، فوکو، دریدہ یا مابعد جدیدیت ہماری مسیحائی کا یارا رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی کہ ہم عقل کو مسلسل کام پر لگائے رکھیں، سریت کے تحقیق و تجزیے پر قدغن نہ لگائیں، معانی کو قصداً نہ تو دبائیں اور نہ ہی اسے اوپر سے تھوپنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہو گا جب تک ہم میں حریتِ فکر کی بحث کو دو بارہ نئے خطوط پر ترتیب دینے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔



اسلام کے حوالے سے صورتِ حال انتہائی امید افزا ہے۔ از کار رفتہ جامد تصورات ٹوٹ پھوٹ کی زد میں ہیں اور مسلم تاریخ میں پہلی بار اتنے اعتماد کے ساتھ انسانی تعبیرات کے تحلیل وتجزیہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ ائمہ اربعہ کا مذہبی تصور جو تاریخ کے راستے ہماری فکر میں داخل ہوا اور جسے رفتہ رفتہ تقدیس کا حامل سمجھا جانے لگا آج پہلی بار کھلے عام مباحث کی میز پر ہے اور یہی حال ان بہت سی فقہی آراء کا ہے جن کے بارے میں اب تک یہ خیال چلا آتا تھا کہ اسے پچھلوں کے اجماع نے ہمیشہ ہمیش کے لیے فیصل کر دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اہل اسلام اس وقت ایک زبردست فکری غلغلے کے جلو میں ہیں۔ گویا اسلام دو بارہ اپنی اصل بنیادوں پر بس اٹھا ہی چاہتا ہے۔

۱۶

کیا اسلام مغرب کی دادرسی کرسکتا ہے؟

بالآخر آفتاب مغرب میں غروب ہوہی گیا۔ اٹھارویں صدی کے Enlightenment سے مغرب میں حریتِ افکار کی جو دنیا پیدا ہوئی تھی اور جس سے یہ امید پیدا ہوچلی تھی کہ اکرام آدمیت، شخصی آزادی اور انسانی حقوق کی یہ تحریک ایک نئی جنتِ ارضی کے قیام پر منتج ہوگی، حیف صد حیف کہ اس رومانی تحریک کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے۔ بحیثیت ایک نظریہ اور تہذیب اس وقت مغرب پر جانکنی کا عالم طاری ہے۔ اسپنگلر نے مغربی تہذیب کے زوال کے سلسلے میں جو واضح پیش گوئی کی تھی اس سے کہیں پہلے مغرب پر زوال کے آثار ہویدا تھے۔ حریتِ فکری کی وہی تحریک جو کبھی اس کے شاندار مستقبل کی ضمانت سمجھی جاتی تھی اس کے زوال کا سبب بن گئی ۔ Enlightenment نے نہ صرف یہ کہ، جیسا کہ Theodor Adorno اور Max Horkheimer کا خیال ہے، ہالوکاسٹ کے لیے نظری جواز فراہم کیا بلکہ اس نے اقدار سے ماورا ایک ایسی خدا بے زاری کو فروغ دیا جس کے بطن سے مسلسل روحانی اور نفسیاتی بحران جنم لیتے رہے ہیں۔

دو عالمی جنگوں میں یورپ کی ایک تہائی آبادی نیست و نابود ہوگئی لیکن اس کے باوجود تحریکِ حریت فکری (Enlightenment) سے اگر حسن ظن برقرار رہا تو اس کی وجہ نئی دنیا امریکہ میں نئے سیاسی شعور کا غلغلہ تھا۔ تب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیمبرانہ آواز کو پائن، جیفرسن اور میڈیسن کا قالب مل گیا ہو۔ انسانی

آزادی کا یہ نعرہ امریکہ میں جس انداز سے بلند ہوا اس کی بازگشت عیسائی دنیا سے باہر بھی سنی گئی۔ صدیوں سے انسانوں نے ایک کھلے معاشرے کا جو خواب دیکھا تھا ایسا لگتا تھا عظیم امریکی خواب (American Dream) اسی کی تعبیر ہے۔ لیکن آج اکیسویں صدی کی ابتدا میں سب کچھ یکسر مختلف لگتا ہے۔ وہی لوگ جو کل تک حریتِ فکر ونظر کے علمبردار تھے انہوں نے گوانتا نامو میں آہنی پنجروں کی ایک ایسی تعذیب گاہ قائم کر ڈالی جہاں اپنے ہی جیسے انسانوں پر بہیمانہ جرائم کو روا رکھا گیا ہے اور یہ سب کچھ مہذب دنیا کے احتجاج کے باوجود برسوں سے جاری ہے۔ یہ صورت حال اس بات پر دال ہے کہ مغرب جس نظریے کا نام تھا اب اس کی موت ہو چکی ہے۔

ہم مسلمان مغرب کے سلسلے میں بیک وقت نفرت اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ ہم مغرب کی خدا بیزاری کے سخت ناقد ہیں۔ روایتی حلقوں میں مغرب کو اباحیت پرستی اور جنسی بے راہ روی کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم مغرب میں فکر کی آزادی اور سب سے بڑھ کر ٹکنالوجی کے کرشموں کو قدر وہیبت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ پچھلی چند دہایوں میں مغرب ان اسلامیوں کے لئے پناہ گاہ بھی ثابت ہوا ہے جو اپنی اپنی حکومتوں کے ظلم وعتاب سے تنگ آکر ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں۔ جی ہاں! لندنستان صرف مغرب کا تہذیبی قبلہ نہیں ہمارے لیے ایک متبادل دنیا بھی ہے جس کی موت پر یقیناً ہماری آنکھوں کو بھی نمناک ہو جانا چاہئے۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ مغرب کی اس موت کا خود مغرب کے اعلیٰ تہذیبی اور علمی حلقوں میں کچھ زیادہ چرچا نہیں۔ اوسولڈ اسپنگلر سے سیموئل ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکو یاما سے ڈیوڈ کولمن اور پیٹرک بچانن تک مغرب کے زوال پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ایماندارنہ تجزیہ کم اور مغرب کے اپنے تعمیر کردہ زعم کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ بشمول اسپنگلر جو دوسری تہذیبوں کو مغربی تہذیب کی تمہید قرار نہیں دیتے، واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام حضرات دوسری تہذیبوں کے سلسلے میں خاصے ذہنی تحفظات کا شکار ہیں۔ انہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ وہ دوسرے تہذیبی ماڈل سے اکتساب فیض کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تمام تحلیل وتجزیے ایک قسم کی مایوسی پر ختم ہو جاتے ہیں اور ہمارے حصے میں تاریخ کے خاتمے کی بشارتِ پرُ ملامت کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا۔ فوکو یاما اور اس قبیل کے دوسرے دانشور جو تاریخ کا ایک سیدھا اور سطحی شعور رکھتے ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا کچھ آسان نہیں کہ مغربی اقوام کے علاوہ دوسری قوموں کے بھی کچھ اپنے خواب

ہوسکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی غیر معمولی فتح کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسری اقوام بھی اس سیاسی نظام کی طالب ہیں یا یہ کہ جمہوریت تاریخ کی آخری منزل ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں انسانوں نے اجتماعی نظام کے جو تجربات کئے ہیں ہوسکتا ہے مغربی جمہوریت ان میں ایک بہتر متبادل ہو لیکن یہ تو ماضی کا فسانہ تھا کہ ہم آج ایک ایسے عہد میں ہیں جسے دراصل مابعد جمہوری عہد کہا جانا چاہیے۔ یہاں جمہوریت نام ہے مختلف قسم کی خباثتوں میں سے کم تر درجے کی خباثت کے انتخاب کا۔ حالیہ برسوں میں مغرب کی شاہراہوں پر عوامی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کھلے عام ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔ اول الذکر کی نمائندگی جنگ مخالف مظاہرین کررہے تھے تو آخر الذکر کی قیادت جابر جمہوری حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ آمرانہ اور سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں فرد جس احساس بے بسی سے دوچار ہے اس کے باوجود اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ''ہم اب ایک ایسے مقام پر آپہونچے ہیں جہاں موجودہ دنیا سے مختلف ایک ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کرسکتے جہاں کوئی ایسا واضح راستہ دکھائی نہ دیتا ہو جو مستقبل کو موجودہ بنیادوں پر ہی مزید بہتر اور مستحکم بنا سکے'' بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، تاریخ کے خاتمے کی دھمکی دیا کرے، تو ایسے مزعوم دانشوروں کے لیے دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے۔

تاریخ کا سفر اپنے اختتام کو تو نہیں پہنچا ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ مغربی تہذیب کی سبقت اور اس کی مقبولیت کا گراف تیزی سے گررہا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں مشرق کے حق میں معاشی قوت کا میزانیہ جس تیزی سے بدلتا رہا ہے ایسا لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بیجنگ اور نئی دہلی کو عالمی دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ ٹکنالوجی کی منتقلی کے نتیجے میں مغرب پر جو براوقت آنے والا تھا، جس کے بارے میں اسپینگلر نے ۱۹۳۱ء میں متنبہ کردیا تھا، وہ گھڑی اب آچکی ہے۔ گوکہ اسپینگلر کی ان پیش گوئیوں کو سرکاری طور پر وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کا یہ عظیم دانشور مستحق تھا لیکن آج اس کی تحریریں پیمبرانہ بصیرت کی حامل معلوم ہوتی ہیں:

> (ایشیائی اور افریقی) نسلوں کے بے شمار اور رنگارنگ ہاتھ جو حرفت وصناعی میں کم نہیں لیکن یہ خاصے سستے دستیاب ہیں، آنے والے دنوں میں سفید فام نسلوں کی معاشی نبیادیں ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ قلی کی سخت محنت کے مقابلے میں سفید فام مزدوروں کی سہل پسندی بالآخر ان کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔ سفید فاموں کی مزدوری فی نفسہ مضحکہ خیز بنتی جارہی ہے۔ پیداوار کا مرکز ثقل

ان سے مستقل دور ہوتا جارہا ہے۔حتی کہ ایشیائی افریقی نژاد انسانوں کے دلوں میں پہلی جنگ عظیم کے بعد سفید فاموں کا رعب و دبدبہ بھی جاتا رہا۔ سفید فاموں کے ملکوں میں بے روزگاری کا بنیادی سبب یہی ہے ۔ یہ محض ایک بحران نہیں بلکہ مکمل تباہی کی ابتداء ہے۔

(*Der Mensch und die Technik*,1931:86)

اصل صورتِ حال اس سے بھی کہیں سنگین ہے جس کی طرف اسپینگلر نے اشارہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان عناصر کی نشاندہی کریں گے جو مغرب کے نظری تصور میں بنیادی عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو ہمارے خیال میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جارہے ہیں:

(۱) عیسائیت جو کبھی مغرب کی سماجی سیاسی اور علمی زندگی کی بنیاد سمجھی جاتی تھی آج اس کی حیثیت ایک فرسودہ خیال اور متروک نظریے کی ہے۔ لڈوگ فائرباخ (۱۸۰۴-۱۸۷۲) کی مشہور زمانہ کتاب *Das Wesen des Christentums* کی اشاعت نے غور وفکر کے پرانے سانچوں کو توڑ ڈالا ۔ اہلِ فکر عیسائیوں کے لیے ایک ایسی کتاب کو الٰہی پیغام کی حیثیت سے قبول کرنا مشکل ہوگیا جو کائنات کا ایک جمودی تصور رکھتی ہو اور جس کی واقفیت دنیا کے صرف تین براعظموں سے ہو۔ آج مغرب میں عیسائیت کی حیثیت ماضی کے ایک فسانہ کی ہے جس نے روحانی زندگی کو ایک مہیب خلا سے دو چار کر رکھا ہے۔ چرچ کی پرشکوہ عمارتیں اپنی بدحالی پر ماتم کناں ہیں اور اس بات پر شاہد کہ لوگوں کی زندگیوں سے کوئی اہم شیٔ رخصت ہوگئی ہے۔ اہلِ فکر اس تکلیف دہ صورتِ حال کو مابعد عیسائیت کا نام دیتے ہیں۔

(۲) دوسرا تشویش ناک مسئلہ آبادی میں روز افزوں زوال سے متعلق ہے۔ ۱۹۶۰ء میں یوروپی نژاد افراد کی تعداد دنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل تھی۔ اقوام متحدہ کے ایک اندازے کے مطابق اگر صورتِ حال یہی رہی تو ۲۰۵۰ء تک یوروپی نسل کے لوگ دنیا کی آبادی کا صرف دس فی صد حصہ رہ جائیں گے۔ سفید فام اقوام کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے بلکہ اس بات کا اندیشہ پیدا ہو چلا ہے کہ کہیں یہ نسل معدوم نہ ہوجائے۔ بچانن نے اپنی چشم کشا تصنیف مغرب کی موت (*The Death of the West*) میں اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں جہاں دنیا کی آبادی دو گنی ہوگئی ہے، یوروپی اقوام (بشمول آسٹریلیائی، امریکی اور کینیڈائی سفید فام) کی آبادی منجمد ہوکر رہ گئی ہے۔ آبادی میں زوال یا انجماد کا یہ رجحان برقرار رہا تو توقع ہے کہ صدی کے نصف تک مزید ۲۳ ملین جرمن پردۂ عدم میں چلے

جائیں گے۔ ان کی مجموعی تعداد جو اس وقت ۹۲ ملین ہے سکڑ کر صرف ۵۹ ملین رہ جائے گی۔ ۲۰۰۰ء میں آئس لینڈ سے روس تک یوروپ کے ۴۷ ممالک کی مجموعی آبادی ۷۲۸ ملین تھی جو صدی کے نصف تک سکڑ کر ۶۰۰ ملین ہوجائے گی۔ ڈیوڈ کولمن بھی کچھ اسی طرح کے اعداد وشمار پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی کے نصف تک ہالینڈ کی ۳۰ فیصد، جرمنی کی ۲۴ فیصد اور برطانیہ کی ۳۶ فیصد آبادی غیر یوروپی اقوام پر مشتمل ہوگی۔ ہنٹنگٹن بھی اس خیال سے پریشان ہیں کہ ۲۰۵۰ء تک امریکہ کی ایک چوتھائی آبادی ہسپانوی باشندوں پر مشتمل ہوگی۔ غیر یوروپی اقوام کی مسلسل بڑھتی تعداد نہ صرف یہ کہ مغرب کو تہذیبی طور پر تحلیل کررہی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اب یہ نئی آبادی اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ وہ مغرب میں اپنے تہذیبی مظاہر کے ساتھ جینے کا سامان کرے۔

مہاجرین کی یہ دوسری نسل جسے اپنے تہذیبی ورثے پر پہلی نسل سے کہیں زیادہ اعتماد ہے مغرب کو اپنی بنیادوں پر ایک نئی شناخت کے ساتھ برتنا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو ان اقدار وتصورات کا کیا ہوگا جو کبھی مغرب کا وصف سمجھے جاتے تھے، جن سے مغرب عبارت تھا۔ کیا غیر سفید فام اقوام، جنہیں صدی کے نصف تک امریکہ میں اکثریت حاصل ہوجانے کی توقع ہے، مغرب کی نمائندہ سمجھی جائیں گی؟ اگر ایسا ہوا تو شاید ہمیں مغرب کی تعریف بدلنی پڑے گی۔ یہ سمجھنا کہ آنے والے دنوں میں سفید فام آبادی کی شرح میں کوئی انقلابی تبدیلی آئے گی خام خیالی ہے۔ اس کا ایک سبب تو social security کا وہ نظام ہے جو بڑھاپے میں پرسکون زندگی کا ضامن ہے۔ لوگ اپنی اولاد پر پیسے خرچ کرنے اور انہیں بڑھاپے کا سہارا بنانے کے بجائے عہد کہولت کی آسائش گاہوں میں جگہ محفوظ کرانا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ سماجی اور معاشی عوامل بھی خاندانی نظام کے جھمیلوں میں پڑنے سے روکتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی نہ تو اتنی تنخواہ ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پاس اتنا وقت اور ایسی سہولت کہ وہ عائلی زندگی کا چیلنج قبول کرسکیں۔ جن مانع حمل ترکیبوں کو کل تک مغرب اپنی ثقافتی برتری کے طور پر پیش کرتا تھا اور جسے دنیا بھر میں مقبول بنانے کے لیے اس نے پروپیگنڈے کا کون سا راستہ اختیار نہیں کیا، افسوس کہ آج وہی ادویات اور ترکیبیں سفید فام نسلوں کے لیے سمّ قاتل بن گئی ہیں۔

(۳) جمہوریت جو کبھی مغربی تہذیب کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی آج اس پر نزاع کا عالم طاری ہے۔ اس کی وجہ صرف وہ سیاہ قوانین نہیں جو برطانیہ میں دہشت مخالف ایکٹ اور امریکہ میں حب الوطنی

ایکٹ کے ناموں سے نافذ کئے گئے ہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ذرائع ابلاغ کا جبری نظام ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے تقریباً تمام ہی بڑے ادارے چند سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہیں مثلاً CNBC NBC اور MSNBC جنرل الکٹرک کی ملکیت ہیں، ABC پر ڈزنی کی اجارہ داری ہے، CNN ٹائم وارنر کا رہین منت ہے اور CBS وائیکوم کا ذیلی ادارہ ہے۔ جب لوگوں کی بصیرت اور بصارت پر چند سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہو، اور لوگ وہی کچھ دیکھنے پر مجبور ہوں جو یہ سرمایہ دار دکھانا چاہتے ہوں تو ایسی صورت میں سیاسی قیادت کا غیر موثر ہوجانا فطری ہے۔ افکار و خیالات کی وہ آزاد منڈی جسے جان اسٹوارٹ مِل نے کبھی صحت مند جمہوری معاشرے کا وصف بتایا تھا ایک ایسی دنیا میں ممکن نہیں رہا جہاں چھوٹے اخبارات اور مقامی رسائل کو بڑے اخبارات نے نگل لیا ہو۔ حد تک تو یہ ہے کہ کتابوں کی صنعت و تجارت بھی اب سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہے، وہ جس کتاب کو چاہیں best-seller بنا دیں اور جس موضوع کو مناسب جانیں دانشوری کے حوالے سے اس پر بحث و مباحثہ کا بازار گرم کر دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کی اس جگمگاتی دنیا میں فرد کی بصارت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے لیے مابعد جمہوری عہد میں یہ سمجھنا خاصا مشکل ہو رہا ہے کہ لبرل ڈیموکریسی کے علمبردار اپنے سیاہ قوانین کے ذریعہ روحِ جمہوریت کے خاتمے پر کیوں مصر ہیں۔ اور یہ کہ وہ تحفظِ جمہوریت کے نام پر ایسے اقدامات کیوں کر رہے ہیں جن کا واضح مطلب جمہوریت کا گلا گھونٹ دینا ہے۔

(۴) ٹکنالوجی اور سرمایہ جس تیزی سے تیسری دنیا کی طرف منتقل ہو رہے ہیں یہ بات بھی مغرب کے لئے کم تشویش ناک نہیں۔ بظاہر نیویارک اسٹاک اکسچینج اب بھی دنیا کا سب سے بڑا اسٹاک اکسچینج ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ امریکی قوم سالانہ ۷۰۰ بلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کر ڈالتی ہے۔ لیکن یہ سب امریکی خوشحالی کا صرف ایک رخ ہے۔ اگر امریکی ہر سال اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی معیشت اور صنعت کو ایشیائی تاجروں اور ماہرین حرفت کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں چین اور ہندوستان میں معیشت کے غیر معمولی نمو کی قیمت بھی امریکہ کو ادا کرنا پڑی ہے جس کے پاس اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ مختلف قسم کی تکنیکی خدمات کے لیے ہندوستان اور چین کے سستے ماہرین پر انحصار کرے۔ انٹرنیٹ نے اگر ایک طرف تکنیکی ماہرین، کلرکوں اور اکاونٹنٹ کی ملازمت غریب ممالک کو منتقل کر دی ہے تو دوسری طرف سستی مزدوری بڑے صنعت کاروں کو اس بات پر مجبور کر رہی ہے کہ

وہ اب نئے صنعتی ادارے چین وہند جیسے ملکوں میں قائم کریں۔معیشت کے رنگ وروپ میں یہ تبدیلی آزاد منڈی کے علمبرداروں کے لئے انتہائی تشویش ناک اور دور رس عواقب کی حامل ہے۔اگر کوئی ملک اپنی پیداواری صلاحیت کو دوسرے ملکوں میں منتقل کرنے پر مجبور ہواور اگر صنعت وحرفت کی تمام یونٹیں فون کے دوسرے سرے پر غیر مما لک میں قائم ہوگئے ہوں تو خود اس ملک میں کرنے والوں کے لئے کون سا کام رہ جائے گا؟ پھر آخر وہاں کس چیز کی تجارت ہوگی؟ اور یہ صورتِ حال کب تک باقی رہ سکے گی؟ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ صرف چین اور امریکہ کے مابین باہمی تجارت میں امریکہ کو ۱۲۵ بلین ڈالر کا خسارہ ہے اور اسے اپنے قومی سرمائے سے ہر روز تقریباً ۱۵ء بلین ڈالر بیرون مما لک سے حاصل کردہ مختلف قسم کی خدمات (outsourced services) کے عوض ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ ماہرین معیشت مسلسل اس اندیشے کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال جاری رہی تو آنے والے دنوں میں امریکہ اور یوروپی یونین کا شمار غریب ونادار مما لک میں ہونے لگے گا۔ اگر پیداواری صلاحیت اور صنعت وحرفت وخدمات کے سارے شعبے اسی طرح بیرون مما لک منتقل ہوتے رہے تو پھر نیویارک اور شکاگو کی فلک بوس عمارتوں میں لوگوں کے لیے کرنے کو کیا رہ جائے گا؟ پال روبرٹس کا اندازہ ہے کہ سال ۲۰۲۴ء تک امریکہ کا جاہ وحشم ختم ہوجائے گا اور اس کی حیثیت ایک فسانۂ ماضی سے زیادہ نہ ہوگی۔

(۵) جمہوریت کی طرح سرمایہ داری بھی اہلِ مغرب کے لیے ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے جس پر معقول تنقید بھی خلافِ عقل سمجھی جاتی ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت کا کوئی متبادل ممکن نہیں۔ ایسا اس لیے بھی کہ پرانے سوشلٹ بھی اب اس نظام کے خوگر ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف اسلامی معیشت کے فلک شگاف نعروں کے باوجود اب تک عالم اسلام میں کسی متبادل معاشی نظام کا خاکہ نہیں ابھر سکا ہے۔لیکن سرمایہ داری کے اس غیر معمولی فروغ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نظام پر سوالیہ نشان نہیں لگایا جاسکتا یا یہ کہ مستقبل میں اس نظام کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرمایہ داری کو سب سے بڑا خطرہ خود سرمایہ داری سے ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہے جو اپنے زندہ رہنے کے لیے خود اپنا ہی جسم کھاتا ہے۔ سرمایہ داری اپنی موجودہ شکل میں ہرگز ہرگز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جس زمانے میں کارل مارکس سرمایہ دارانہ نظام کی تنقید لکھ رہے تھے اس وقت تک ''خالص سرمایہ'' صحیح معنوں میں منقح نہیں ہوا تھا کہ تب کارپوریٹ کیپٹلزم کا دور نہیں تھا۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ اب سرمایہ دار یہ طئے

کر رہے ہیں کہ ہم کیسے سوچیں، کیسے محسوس کریں اور زندگی جینے کا ہمارا طور طریقہ کیا ہو۔ سرمایہ داروں کی تعمیر کردہ اس دنیا میں ہماری حیثیت اب صرف ایک صارف کی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں اور بے پناہ وسائل کے حامل عالمی ساہوکار ایسے تعلیمی اداروں اور اوقاف کے قیام میں دلچسپی لے رہے ہیں جن کا مقصد بظاہر تو فلاحی نوعیت کا علمی اور تحقیقی کام ہے لیکن فی الواقع ان اداروں کے ذریعہ وہ اپنے اندازِ فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ گویا انسانوں کے لئے آزادنہ غور وفکر کا جو تھوڑا بہت امکان پایا جاتا تھا اس پر بھی پہرہ بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مٹی بھر سرمایہ دار جو اس دنیا کے وسائل پر قابض ہو گئے ہیں ان کی دولت میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ان کی دولت جس قدر بڑھتی جاتی ہے ان کی قوت میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان عالمی ساہوکاروں کا دائرہ اختیار چوں کہ کسی مخصوص ملک کی سرحد سے پرے ہوتا ہے اس لیے کسی احمدی نژاد یا ہوگوشاویز کے بس میں نہیں کہ وہ ان کو لگام دے سکے۔ تو کیا سرمایہ داری کے اس خوفناک دیو کو قابو میں نہیں کیا جاسکتا؟ بظاہر تو یہی لگتا ہے اس لیے کہ اب نہ اس کا کوئی مدمقابل بچا ہے اور نہ ہی ہم اب تک کوئی نظری متبادل تیار کر پائے ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا، سرمایہ داری خود اپنے آپ کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ سرمایہ داری اس بات سے عبارت ہے کہ پیداوار میں روز افزوں اضافہ کیا جائے۔ پیداوار جتنی بڑھے گی سرمایہ میں اسی قدر اضافہ ہوگا۔ لیکن اضافے کی بھی تو کوئی حد ہوگی۔ گذشتہ چند دہائیوں میں اس کلیے پر جتنی مستعدی سے عمل ہوا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم خود کو گونا گوں قسم کے ماحولیاتی مسائل سے دوچار پاتے ہیں۔ موسم کا عدم توازن، توانائی کا بحران، صاف پانی کی قلت اور فطرت اور انسان کے مابین بے شمار ایسے مسائل جن کا احاطہ ہونا ابھی باقی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سرمایہ داری کا متبادل کیا ہوسکتا ہے البتہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ مروجہ سرمایہ داری کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔

یہ ہے وہ تکلیف دہ صورتِ حال جس سے اس وقت مغرب دو چار ہے۔ مغربی تہذیب جو گذشتہ دوسو سال سے ہم میں سے بہتوں کے لیے منارۂ نور کی مانند رہی ہے کسی آسمانی ہدایت کی پروردہ نہیں تھی۔ بلکہ انسانی عقل نے صدیوں کے سفر میں دانش کی جو اجتماعی پونجی جمع کی تھی اور جس میں جان ومال کا تحفظ، عقیدے کی آزادی، انسانی حقوق، حریتِ فکری اور مسرت کے حصول کو بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل تھی اسے ہی کام میں لایا گیا تھا۔ مغربی افکار وتصورات سے ہمارے بنیادی اختلاف کے باوجود ہمارے لیے یہ

صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ ہے کہ انسانی امیدوں کا ایک جزیرہ جس پر گاہے بگاہے ہم ساکنینِ مشرق بھی پناہ گزیں ہوتے رہے ہیں یوں ہماری آنکھوں کے سامنے ڈوب جائے۔

مغرب کا یہ بحران جس طرح سفید فام انسانوں کے لیے باعثِ اضطراب ہے اسی طرح ہمارے لیے بھی اس میں فکرمندی کا وافر سامان پایا جاتا ہے۔ اگر انسانوں کی کوئی نسل نمو سے محروم یا صفحۂ ہستی سے غائب ہوجائے تو شعوب وقبائل کا فطری نظام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ یہ خدائی اسکیم کا حصہ ہے کہ وہ انسانوں کو شعوب وقبائل میں پیدا کرے، سیاہ وسفید، مردوزن اور اس طرح کی دیگر شناخت اور صلاحیتوں سے متصف کرے۔ خدا نے ہر قوم اور ہر جغرافیائی خطے کو اپنے مخصوص فضل سے نوازا ہے۔ امت وسط یا عالمی امت کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہم قومی اور ملی مفادات سے اوپر اٹھ کر عالمی مفادات کو ملحوظ رکھیں۔ اگر مغربی دنیا پر تباہی آئے گی تو اس کے اثرات سے ہم ساکنین مشرق بھی کب بچ پائیں گے؟

تو کیا اس فیصلہ کن گھڑی میں اسلام مغرب کی دادرسائی کے لیے آگے آسکتا ہے؟ ایک مسلمان کی حیثیت سے جو اسلام کو آخری لمحے تک تمام اقوامِ عالم کی مکمل ہدایت کا دین سمجھتا ہو اس کے لیے اس سوال کا جواب نفی میں دینا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ البتہ عام لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ آسان نہیں کہ جو امت گذشتہ کئی صدیوں سے خود زوال پذیر ہو جو فی زمانہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا بنیادی ہدف ٹھہرائی گئی ہو اور جس کی تمام توانائی اپنی مدافعت میں صرف ہو کر رہ گئی ہو آخر وہ اتنا بڑا چیلنج کیسے قبول کرسکتی ہے۔ اس طرزِ فکر کے پیچھے دراصل روایتی فقہی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ مسلم علماء جو صدیوں سے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر میں منقسم دیکھنے کے عادی رہے ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ آخر ہمیں دارالاسلام سے باہر اصلاحِ احوال کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن ان تمام عملی دشواریوں کے باوجود اسلام کے حوالے سے صورتِ حال انتہائی امید افزا ہے۔ از کار رفتہ جامد تصورات ٹوٹ پھوٹ کی زد میں ہیں اور مسلم تاریخ میں پہلی بار اتنے اعتماد کے ساتھ انسانی تعبیرات کے تحلیل وتجزیہ کی کوشش کی جارہی ہے۔ ائمہ اربعہ کا مذہبی تصور جو تاریخ کے راستے ہماری فکر میں داخل ہوا اور جسے رفتہ رفتہ تقدیس کا حامل سمجھا جانے لگا آج پہلی بار کھلے عام مباحثے کی میز پر ہے اور یہی حال ان بہت سی فقہی آراء کا ہے جن کے بارے میں اب تک یہ خیال چلا آتا تھا کہ اسے پچھلوں کے اجماع نے ہمیشہ ہمیش کے

لیے فیصل کر دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اہل اسلام اس وقت ایک زبردست فکری غلغلے کے جلو میں ہیں۔ گویا اسلام دوبارہ اپنی اصل بنیادوں پر بس اٹھا ہی چاہتا ہے۔

دریں اثنا مغرب میں مسلم دانشوروں کی ایک نسل فکری بلوغ کے ابتدائی مراحل میں داخل ہوگئی ہے جو مختلف مسلمہ امور کو جنھیں اب تک تقدیس کا درجہ حاصل تھا، دوبارہ بحث وتمحیص کا موضوع بنانا چاہتی ہے۔ گو کہ ان کی فکری اٹھان اسی پرانے فقہی ڈھانچے میں ہوئی ہے لیکن پچھلے چند برسوں میں ان میں سے بعض حضرات کی تحریروں نے اسلام اور مغرب کے مابین نئے پلوں کی تعمیر کا امکان روشن کردیا ہے۔ یہ تحریریں گرچہ مدافعانہ بلکہ بسا اوقات معذرت خواہانہ لب ولہجے کی حامل ہیں جسے یقیناً پیغمبرانہ اسلام کی بلند آہنگی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں البتہ ان کے ذریعے آنے والے دنوں میں کہیں زیادہ گہرائی سے ان امور پر پُر اعتماد غور وفکر کی راہ ہموار کرسکتی ہے۔ مغرب کے لئے ان تحریروں میں دلچسپی کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں پہلی بار مسلمانوں کو مغرب کی تعمیر میں بھر پور شرکت کی نظری اساس فراہم کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس قبیل کی کوششوں میں بعض بنیادی فکری خامیاں موجود ہیں۔ اگر ایک طرف مسلم مفکرین اپنی سادہ لوحی میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مغربی معاشرے میں ان کی بھر پور شرکت مغرب کا رُخ بدل سکتی ہے تو دوسری طرف اہلِ مغرب اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ان کے زوال پذیر معاشرے میں نئے مسلم خون کی شمولیت ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کا احیاء کرسکتی ہے۔ ہمارے خیال میں ایک ایسی مسلم اقلیت سے جسے نئے ماحول میں ابھی اپنی صحیح قدر وقیمت اور سمت کا اندازہ لگانے میں بھی دقتوں کا سامنا ہو، ایسی توقعات شاید برمحل نہیں۔ اولاً مغرب جس بحران سے دوچار ہے وہ بنیادی طور پر تہذیبی نوعیت کا ہے روحانی نہیں۔ ثانیاً اسلام کو محض ایک روحانی نظام سمجھنا ایک ہمہ گیر دین کو اخلاقی تعلیمات ورسوم میں محدود کردینا ہوگا جو یقیناً اسلام کی صحیح اور بھر پور تعبیر نہیں ہوگی۔ ایک ایسی تہذیب جہاں اقدار کی دنیا تہ وبالا ہوگئی ہو، جہاں خدا کو بڑی مشکل سے حاشیے پر جگہ ملی ہو، جہاں افزائشِ نسل کے بغیر جنسی زندگی کو انسانی آزادی کی معراج سمجھا جاتا ہو، جہاں جمہوری نظام کو چند سرمایہ داروں نے یرغمال بنالیا ہو، جہاں سرمایہ داروں کی بے لگام ہوس نے سستی مزدوری کی تلاش میں صنعت وحرفت اور پیداوار کو تیسری دنیا کے ملکوں میں منتقل کردیا ہو اور جہاں کارپوریٹ کیپٹلزم کو مزید انگیز کئے جانا دنیا کی مکمل تباہی کا شاخسانہ ہو، ایک ایسی تباہ حال تہذیب میں اخلاقی اور روحانی مسلمانوں کی ایک قلیل آبادی کے انضمام سے تہذیب کا بنیادی قالب کیسے بدل سکتا ہے؟

مغرب کا یہ بحران کہیں بہتر توجہ کا طالب ہے۔ اقوامِ مغرب پر یہ بات بہت تیزی سے واضح ہوتی جارہی ہے کہ دنیا جینے کا یہ انداز انتہائی غیر عاقلانہ بلکہ سراسر مفسدانہ ہے۔ ان میں سے بہتیرے اس حماقت آمیز طرزِ زندگی کو ترک کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ انھیں کوئی متبادل دکھائی نہیں دیتا۔ خود مسلم دنیا سرمایہ دارانہ نظام کا حصّہ بن چکی ہے۔ اب محض خالی خولی تبلیغی کاوشیں نہ تو کسی کو متوجہ کرسکتی ہیں اور نہ ہی ان کے ذریعہ حالات کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔ اسلام، مسلمان، مغرب بلکہ تمام اقوامِ عالم کے مستقبل کا انحصار اب اس بات پر ہے کہ آنے والے دنوں میں مسلم علماء ودانشور دنیا کو سرمایہ داری کے شکنجوں سے نجات دلانے کے لئے کیا متبادل پیش کرتے ہیں۔ وحی ربانی کی روشنی میں پیمبرانہ مشن کی تشکیلِ نو کی ضرورت جتنی آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔



دین اسلام کی یہ تعبیر کہ اہل حق کے دوسرے طائفوں پر نجات کے دروازے بند ہیں اور یہ کہ اس قسم کی بشارت پر مشتمل قرآنی آیات منسوخ یا مؤول ہیں ایسی انسانی تعبیریں ہیں جنہیں حتمی صداقت کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ کلمۃ سواء کی بنیاد پر اہل حق کے طائفوں کو مجتمع کرنے میں یہ تعبیریں جو اپنا خاص ثقافتی اور سماجی پس منظر رکھتی ہیں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ عالمی نظام انصاف کی قیادت کے لئے مسلمانوں کو ازسرنو اسی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس کا قرآن داعی ہے۔

۱۷

صبح کل آئے گی

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ راتوں رات وجود میں نہیں آ گئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے مدینۃ النبیؐ سے عالمی دارالحکومت کی دمشق منتقلی کے بعد بغداد، استنبول، ایمسٹرڈم اور لندن کے بعد اب واشنگٹن ڈی سی کو دنیا کے دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ گوکہ اس وقت عالمی سطح پر دوسرے اقوام وملل بھی قوت کے میزانئے میں اپنا کچھ نہ کچھ وزن رکھتے ہیں مثلاً روس اور چین کو نظرانداز کیا جانا ممکن نہیں اور نہ ہی فرانس، برطانیہ اور جرمنی کی اقتصادی قوت سے یکسر صرف نظری ممکن ہے۔ دوسری طرف ہندوستان جیسی ابھرتی معیشت بھی اپنی سبقت کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے۔ ایک طرف یورولینڈ کے ارتقاء نے جہاں ڈالر کے مقابلے میں ایک متبادل معیشت کا بگل بجادیا ہے تو دوسری طرف دنیا میں اس حقیقت کا بھی اعتراف ہوتا رہا ہے کہ اکیسویں صدی کی دنیا کو متحرک رکھنے کے لئے ایندھن کے جو ذخائر شہہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ایک خاصہ بڑا حصہ عالم اسلام میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایندھن کے پچاس فیصد ذخائر صرف پانچ ممالک میں موجود ہیں گویا آنے والے دنوں میں دنیا عالم اسلام سے بے نیاز ہوکر مستقبل کا منصوبہ تشکیل نہیں دے سکتی۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قوت کے جزیرے دنیا کے مختلف خطوں میں واقع ہیں لیکن عملاً واشنگٹن ڈی سی کا قوت کے ان تمام بکھرے جزیروں پر کنٹرول قائم ہوگیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد عالمی

سطح پر جو اتھل پتھل ہوئی ہے اس نے اس حقیقت کو مزید منکشف کر دیا ہے کہ سیکورٹی کونسل کے دوسرے ممبران کی اہمیت کے باوجود دنیا میں عملاً فیصلہ کن حیثیت واشنگٹن ڈی سی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے اعتراف کے بغیر صورت حال کی تبدیلی کے لئے اگر کوئی منصوبہ تشکیل دیا گیا تو اسے حقیقت پسندی سے اجتناب پر محمول کیا جائے گا۔

صورتِ حال کے اس اعتراف کے بعد اس حقیقت کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی بھی صورتِ حال ایسی نہیں جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی انسانی تاریخ میں کبھی کوئی قوت نا قابل تسخیر رہی ہے۔ ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خوش فہمیوں سے بلند ہوکر جذباتی طرز فکر سے کنارہ کشی کرتے ہوئے ایک حقیقت پسند اسٹریٹیجی تشکیل دیں۔ افسوس کہ گیارہ ستمبر کے واقعہ کو کوئی ساڑھے چار سال کا عرصہ گزرا، امت مسلمہ جو ان تمام ایام میں امریکی نشانے کی زد پر رہی ہے اب تک حقیقت حال کا اعتراف کرنے اور کسی عملی جدوجہد کا منصوبہ تشکیل دینے میں سہل پسندی سے کام لیتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عراق میں امریکی مشن کا طول اور افغانستان میں کرزئی حکومت کی حدودِ کابل میں محصوری، فلسطین میں حماس کی کامیابی، پاکستان میں دینی جماعتوں کا سیاسی عروج اور خود امریکہ میں بش انتظامیہ کے مسلسل گرتے گراف نے امریکی استعمار کے لئے خاصی دشواریاں پیدا کردی ہیں لیکن اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امریکی استعمار کی اس جزوی ہزیمت سے عنقریب امریکہ کے زوال کا راستہ ہموار ہو گیا ہے یا یہ کہ واشنگٹن ڈی سی کا سقوط اب چند دنوں کی بات ہے تو ایسا سوچنا دراصل خوش فہمیوں کی دنیا میں جینا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو کوئی بھی نظام زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ لیکن امریکہ میں جس طرح بش حکومت کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، عراق کے مسئلے پر حکمراں طائفے پر عوام کو گمراہ کرنے کا الزام لگ رہا ہے اور جس طرح خود امریکہ کے اندر اہل فکر سیاسی و سماجی کارکن اور انسانی حقوق کے چھوٹے بڑے ادارے حریت فکر وعمل کو برقرار رکھنے کے لئے میدان میں آرہے ہیں اس نے امریکی نظام کے اندر اصلاح کے امکانات کو برقرار رکھا ہے۔ امریکی جمہوریت کی یہی وہ قوت ہے جو ظلم و استحصال کی پالیسیوں کے باوجود اسے زندگی جینے کا مزید موقع فراہم کرتی رہی ہے اور اگر اس سلسلے پر بش کا طائفہ یکسر روک لگانے میں ناکام رہا تو فکر ونظر کی یہی آزادی واشنگٹن ڈی سی کو مزید عالمی دارالحکومت کی حیثیت سے برقرار رکھ سکے گی۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد ریاست سے وابستہ بعض امریکی دانشوروں اور پالیسی سازوں

نے اسلام کو ایک نئے خطرے کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان کی اس ژولیدہ فکری کو مواد فراہم کرنے میں ان پر جوش دینی تنظیموں، انجمنوں نے اہم رول ادا کیا جو کبھی امریکی عزائم کے حلیف بن کر روس کے خلاف افغانستان میں سرگرم عمل تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان کو سوویت یونین کے قبضے سے بچانا اور سرخ انقلاب کی توسیع پسندی کو لگام دینا اس وقت بیشتر مسلم ممالک بشمول پاکستان کی اپنی ضرورت تھی۔ تب امریکی امداد ان کے وقتی مقاصد سے ہم آہنگ تھی۔ البتہ سوویت یونین کے انخلاء کے بعد جہادی تنظیمیں اس حقیقت کو فراموش کر گئیں کہ سوویت یونین کی پسپائی میں ان کے زورِ بازو کے علاوہ دوسرے محرکات بھی کلیدی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ جہاد افغانستان کے دوران مافوق الفطری واقعات کا ہونا' شہداء کی لاشوں سے متعلق کشف و کرامات کے واقعات اور ان جیسی عوامی داستانوں نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی طور پر ایک ایسی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کیا جہاں حقیقت پسندی کے بجائے رومانس کا غلبہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ایک مشترکہ حکومت کی تشکیل پر متفق نہ ہو سکے اور جن کی قبائلی عصبیت یا گروہی وابستگی اسلام کے اجتماعی مفاد پر غالب رہی' وہ یہ خواب دیکھنے لگے کہ سوویت یونین کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے بعد اب وہ دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کا بھی وہی حشر کر سکتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کی اس رومان پسندی نے'جس میں حالات کے حقیقت پسندانہ تجزیے کے بجائے جوش و جذبہ کو کہیں زیادہ دخل تھا'پوری امت کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس کے سبب ہم بغیر کسی تیاری کے مغرب سے دو دو ہاتھ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جدید دنیا کی طرف اسلام پسندوں کے اس رومانوی رویے کے پیچھے بعض ایسی اساطیری داستانیں بھی سرگرم رہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن جس نے ہمارے زوال کے عہد میں مسلم فکر میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں صدی کے پہلے دن جہیمان العتیبہ نے جب حرم مکی کا محاصرہ کیا تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ نئی صدی کا نیا سورج جس شخص کے ہاتھوں طلوع ہوگا اس کا تعلق اسی مہدیٔ برحق کے طائفے سے ہے۔ یہ روایت کہ ہر صدی کے سرے پر خدا کوئی مجدد پیدا کرے گا فنی اعتبار سے بے اصل ہونے کے باوجود صدیوں سے ہماری راسخ العقیدہ فکر کا حصہ بنی رہی ہے۔ ایران میں خمینی کی قیادت میں صدیوں سے خوابیدہ شیعہ فکر کے احیاء نے بھی سنی مسلمانوں کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دنیا بھر سے اسلام پسند تنظیمیں جو جہاد افغانستان کے حوالے سے پاکستان کے سرحدی شہروں میں جمع ہو گئی تھیں اب نفسیاتی طور پر اپنے کو فاتح تصور کرتیں اور نئی صدی میں اسلامی احیاء کے لئے کوئی ٹھوس اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کے بجائے اساطیری ماحول سے غذا حاصل کرتیں۔ طالبان کی

حکمرانی کے بعد امیر المؤمنین جیسی اصطلاحوں کے استعمال سے اس رومانی لب ولہجہ کی تشکیل میں مزید مدد ملی۔ ایسا محسوس ہوا گویا بیسویں صدی کے آخری عشرے میں انصار ومہاجرین کا گروہ ایک بار پھر باطل سے نبردآزما ہونے کے لئے نئی صدی کے مدینہ، قندھار اور اس کے اطراف میں جمع ہوگیا ہے۔ نہ تو مسلم اہل فکر نے صحیح صورتِ حال کے ادراک کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی نئے مہاجرین وانصار کو اس حقیقت سے آگہی ہوسکی کہ وہ جس نظام کو شکست دینا چاہتے ہیں ان کے پاس اس کے لئے سرے سے مطلوبہ تیاری ہے ہی نہیں۔ طالبان رسومِ دین داری کو اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ حلقۂ دیوبند کی جامد رسوم دین داری سے آگے سوچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ تھے، خود اہل قبلہ کے دوسرے گروہوں کا ایمان ان کے لئے قابل اعتبار نہ تھا۔ cultic-thinking کے حامل لوگ اگر اساطیری توہمات کا شکار ہوجائیں تو وہ اپنے غیر عقلی رویے سے کسی بڑے حادثے کو تو جنم دے سکتے ہیں البتہ کسی نئی دنیا کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے۔

گیارہ ستمبر کے واقعہ کو کوئی سات سال ہونے کو آرہے ہیں اب تک امت مسلمہ عوامی سطح پر بار کوخبا سنڈروم سے باہر نہیں آسکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب رومی گورنر کے ظلم وجبر سے تنگ آکر بارکوخبا نے مسلح بغاوت کا اعلان کیا تو اسے ہر خاص وعام یہودی کی ہمدردی حاصل ہوگئی۔ حالات سخت تھے اور عوام اس سے نجات کے طالب بھی۔ بارکوخبا کی عسکری لیاقت اور اس کی سلیم الفکری پر تو شاید ہی کسی کو اعتبار تھا البتہ عوام تو عوام خواص بھی یہ سمجھتے تھے کہ رومیوں کو چیلنج دینے کا حوصلہ تو بہرحال اس میں ہے۔ ربائی اکیوا جسے اہل یہود کی مذہبی فکر میں بڑی اہمیت حاصل ہے انہوں نے بھی بارکوخبا کی حمایت کا اعلان کردیا۔ جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ بارکوخبا کی عسکری تیاری اور اس کی فکری لیاقت کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے اس وقت کا مسیحا تسلیم کرلیا گیا اور پوری یہودی قوم اس کے پیچھے آگئی۔ ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا گویا اہل یہود اپنا کھویا ہوا جاہ وحشم حاصل کرنے کی پوزیشن میں آگئے ہوں۔ لیکن کہاں رومی حکومت کی منظّم طاقت اور کہاں اہل یہود کے بے ہنگم گروہ اور ان کی خالی خولی نعرہ بازیاں۔ بارکوخبا کی بغاوت اس طرح کچلی گئی کہ ایک طویل مدت تک کے لئے اہل یہود پر سخت مایوسی طاری ہوگئی۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں جب فلسطین سے پشاور تک اور انڈونیشیا سے مراکش تک اسامہ بن لادن کی حمایت میں عوامی جوش وجذبہ کا یہ عالم تھا گویا پوری مسلم قوم ان کی قیادت میں متحد ہوگئی ہو۔ اساطیری ماحول حقیقت پسندی سے اجتناب کی راہ دکھاتے ہیں۔ یہ وقتی طور پر کسی بارکوخبا، کسی سباطائی زی وی، کسی جہیمان العتیبہ اور کسی بن لادن کو تو پیدا کرسکتے ہیں البتہ اساطیری جوش وجذبات پر ابھرنے والی تحریکوں سے انسانی تاریخ میں کبھی بھی کوئی نئی دنیا

پیدا نہیں کی جاسکی ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بن لادن یا دوسرے جہادی گروہ موجودہ عالمی نظام کی جن ناانصافیوں کو نشانۂ تنقید بناتے ہیں یا صورتِ حال کی اصلاح کا جو داعیہ انہیں سرگرم رکھتا ہے انہیں عقلی یا مذہبی بنیادوں پر مسترد کیا جاسکتا ہے۔ البتہ وہ جس طرح دنیا کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس سے صاف لگتا ہے کہ انہیں جدید دنیا کی واقعی تفہیم حاصل نہیں ہے۔ نظری اعتبار سے بھی وہ اسلام کی ان جامد تعبیرات کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں جسے استعماری عہد کی پیداوار کہا جاسکتا ہے جہاں ہمارے اہل فکر نے اسلام کو صرف مدافعت کی زبان میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

صبح کل آئے گی

مدینۃ النبیؐ سے واشنگٹن ڈی سی کے سفر تک کوئی چودہ صدیوں کا عرصہ گزرا ہے البتہ ضروری نہیں کہ اس پورے تاریخی سفر کی بساط لپیٹنے کے لئے بھی اتنی ہی مدت درکار ہو۔ اگر ہم ان عوامل کی نشاندہی میں کامیاب ہوگئے جس نے کل ساتویں صدی کے مدینہ کو عالمی دارالحکومت میں تبدیل کردیا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک بار پھر دنیا کے سیاہ و سفید کے فیصلے ان کے ہاتھوں میں آجائیں جو نظری طور پر خود کو آخری رسولؐ کی امت سمجھتے ہیں۔ البتہ ان عوامل کی نشاندہی میں صرف مدینۃ النبیؐ کا زمانی و مکانی مطالعہ کافی نہ ہوگا کہ ایسا کرنا ہوسکتا ہے کہ ہمیں تاریخ پر غیر معمولی انحصار پر مجبور کرے بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر وحی ربانی کی روشنی میں ہمیں ان عوامل کی نشاندہی کرنی ہوگی جسے قرآن نے سیادت پر مامور قوموں کا وصف بتایا ہے۔ پھر تکملہ کے طور پر اس بات کا جائزہ لینا بھی مناسب ہوگا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں بوجوہ واشنگٹن ڈی سی کو عالمی منظرنامے میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ گویا نئی دنیا کی تفہیم کے بغیر وحی ربانی کی حامل امت سیادت عالم کے فریضۂ منصبی کا کماحقہ حق ادا نہیں کرسکتی۔

نئے منصوبے پر کام کی ابتداء کے لئے ایک نئے مسلم ذہن کی تشکیل پہلا مرحلہ ہوگا۔ وحی ربانی کے ازسرنو مطالعے سے ہمیں بعض ان معتقدات کو جو کثرت تکرار سے کلیشے بن گئے ہیں نئے فکری ڈھانچے میں نئی معنویت عطا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مختصراً میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن مجید وحی ربانی کا آخری غیر محرف وثیقہ ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی کوئی نظیر اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کا مطالبہ ہے کہ انسانی ذہن غور و فکر، تدبر و تفکر کے سلسلے کو جاری

رکھے۔ گویا قرآن مجید کی مرکزی اور کلیدی اہمیت کو کسی تاریخی، تفسیری، تعبیری ادب کے تابع نہ کیا جائے۔

۲۔ محمدؐ رسول اللہ کے متبعین ایک ایسی عالمگیر دعوت کے امین ہیں جس میں ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب، موسیٰ و عیسیٰ اور تمام سچے انبیاء کی جدوجہد کا ارتکاز پایا جاتا ہے۔ اس عالمگیر دعوت کو دین محمدی پر محمول کرنا رسول اللہ کی عظمت کی سچی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ رحمۃ للعالمین اور بشیراً و نذیرا کے متبعین کو چاہئے کہ وہ محض اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے بجائے پوری انسانیت کی دادرسی کا عملی مظاہرہ کریں۔ اس کے برعکس اگر متبعین محمدؐ صرف اپنے قومی افتخار کی بلندی یا امت محمدیہ کی فلاح و بہبود میں مصروف ہوگئے تو ایسا کرنا اس عظیم تر انسانی مشن سے انحراف ہوگا۔

۳۔ قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ ایک ایسے صاف ستھرے شفاف اسلوب کو اختیار کرنے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ترسیل کی سطح پر یہاں کسی ابہام کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس لئے محض زبان اور ثقافت کی وجہ سے ایک عالمی کتاب پر اہل عرب کی اجارہ داری کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ مختصراً یہ کہ اسلام کی صحرائی اٹھان کے باوجود عرب ثقافت اس کا جزوِ لاینفک نہیں ہے جسے آسمانی پیغام کی طرح تقدس حاصل ہو۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم کی صدائے عام اس بات سے عبارت ہے کہ مستقبل کا اسلامی معاشرہ عرب وعجم، سیاہ و سفید، نسب و رنگ کے امتیازات سے بالاتر ہوگا۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہوگی اور نہ ہی کسی خاص ثقافت کو اسلام کا اصل الاصل قالب گردانا جائے گا۔

۴۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے مستقبل کی انسانی تاریخ میں متبعین محمد کی کلیدی اہمیت مسلم ہے البتہ نوع انسانی کی قیادت کا یہ کام مسلمان تن تنہا انجام دے سکتے اور نہ ہی وہ اس کے لئے مکلّف ہیں۔ ایک عالمی نظام کی تشکیل میں کلمۃ سواء کی بنیاد پر دوسری اہل ایمان قوموں کو شرکت کی دعوت ہمارے مقاصد کے حصول کو آسان کردے گی۔ ماضی میں اسی وسعتِ قلبی نے ہمیں ناقابل تسخیر phenomenon میں تبدیل کردیا تھا۔

۵۔ دین اسلام کی یہ تعبیر کہ اہل حق کے دوسرے طائفوں پر نجات کے دروازے بند ہیں اور یہ کہ اس قسم کی بشارت پر مشتمل قرآنی آیات منسوخ یا مؤل ہیں ایسی انسانی تعبیریں ہیں جنہیں حتمی صداقت کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ کلمۃ سواء کی بنیاد پر اہل حق کے طائفوں کو مجتمع کرنے میں یہ تعبیریں جو اپنا خاص ثقافتی اور سماجی پس منظر رکھتی ہیں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ عالمی نظام انصاف

کی قیادت کے لئے مسلمانوں کو ازسرنو اسی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا جس کا قرآن داعی ہے۔

۶۔ بعض ثقافتی تاریخی اور سیاسی عوامل کے سبب مسلم معاشرے میں عورت کے سماجی رول کی نفی کی جاتی رہی ہے۔ احکام حجاب کو ثقافت کا تابع کردینے کی وجہ سے مسلم معاشرے کی آدھی قوت صدیوں سے کالعدم ہے۔ مختلف زمانوں میں فقہائے اسلام نے عورت کے دائرۂ کار کے تعین اور حجاب سے متعلق جو رہنما خطوط تشکیل دیئے ہیں اسے وحی کی لازوال تعبیر کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا کہ بسااوقات یہ تعبیریں عہد رسولؐ کی مدنی زندگی سے متصادم نظر آتی ہیں۔ عالمی سطح پر ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کا قیام عورتوں کو ان کے قرآنی حقوق لوٹائے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

۷۔ قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لئے کتاب ہدایت ہے۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ کہ وہ کتاب مفصل ہے، کسی لمبی چوڑی تشریح وتعبیر کے امکان کی نفی کرتا ہے۔ خدا جو قادر مطلق ہے وہ یقیناً بندوں کے مقابلے میں اظہار پر کہیں زیادہ قادر ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ فہم قرآن میں تفسیری اور تعبیری ادب کو کلیدی اہمیت کا حامل سمجھا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شانِ نزول کی غیر معتبر روایتوں میں وحی کے معانی کو مقید کرنے کے بجائے قرآن مجید کو عصر حاضر کی وحی کے طور پر پڑھا جائے۔ بیان للناس کا قرآنی دعویٰ ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اسے کتاب ہدایت کی حیثیت سے پڑھنے اور برتنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایسا کرنا قرآن کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر عوامی تحریک کو جنم دینے کا موجب ہوگا۔

۸۔ اسلام جس نظام عدل، اخوت اور مساوات کا علم بردار ہے اس کی عملی تعبیر ایک ایسی فضا میں ہی ہوسکتی ہے جہاں انسان اور خدا کے مابین کوئی انسانی ادارہ یا کسی مذہبی پیشوائی کو کوئی دخل نہ ہو۔ علم اور اہل علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم۔ اہل علم سے اکتساب تو کیا جاسکتا ہے البتہ انہیں religious authority کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ قرآن جس حریت فکر کا داعی ہے اور رسول کو ﴿ ویضع عنهم اصرهم والأغلال التی کانت علیهم ﴾ کے جس فریضۂ منصبی پر مامور بتایا گیا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ مسلم ذہن مشائخ پرستی سے آزاد ہو کر لوجہ اللہ ایک نئی ابتدا کا اہتمام کرے۔ عین ممکن ہے کہ نئی ابتداء کے اہتمام میں متبعین محمدؐ سے بعض فکری اور عملی لغزشوں کا صدور بھی ہو۔ انسانوں سے ایسی توقع غیر فطری نہیں۔ لیکن قرآن مجید کا بار بار تدبر وتفکر اور تعقل پر اصرار ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم سلفِ صالحین کی فہم کو حرف آخر سمجھنے اور ان کی تعبیری غلطیوں کو اپنے کندھوں

پر ڈھونے کے بجائے اپنی غلطیوں کی طرح ڈالیں۔ سلفِ صالحین جن کی لغزشوں کو بوجوہ تقدس کا مقام حاصل ہوگیا ہے اس کے مقابلے میں عصر حاضر کے انسانوں کی لغزشوں کا محاکمہ اور ان کی اصلاح کا کام نسبتاً آسان ہوگا۔

یہ وہ چند بنیادی نکات ہیں جن کے سرسری تذکرے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کی صورتِ حال میں ایک انقلابی تبدیلی کے لئے نئے مسلم ذہن کی تشکیل کو کلیدی اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بھی ہونا چاہئے کہ نئے ذہن کی تشکیل کے لئے تیرہ صدیوں پر مشتمل تعبیری ادب میں بنا بنایا فکری سرمایہ خاصہ کم ہے۔ روایتی طرزِ فکر جو قرآن کے بجائے اساطیری ماحول سے غذا حاصل کرتی ہے نسلاً بعد نسل ایک مصنف سے دوسرے مصنف کی کتابوں میں نقل ہوتے رہنے کے سبب راسخ العقیدہ فکر کا ترجمان بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں قرآن مجید کو اصل الاصل تناظر میں پڑھنے کی دعوت ایک ہمہ گیر علمی تحریک برپا کئے بغیر مؤثر نہ ہوسکے گی۔ ماضی میں بعض اصحاب نے روایتی ذہن پر ضرب لگانے کے لئے جو فکری کوششیں کی ہیں انہیں امت میں قبول عام نہ مل سکا۔ ایسی تحریریں تفردات قرار دے کر لائبریریوں کی زینت بنادی گئیں۔ عصرحاضر کے شارحین کے لئے لازم ہوگا کہ وہ علمی تفردات میں اضافے کے بجائے قرآن مجید کو عملی رہنمائی کا مرکز بنائیں۔ خالص علمی مباحث اور تفردات کی نکتہ آفرینی کے بجائے قرآن مجید کو ایک ایسی عام فہم کتاب کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی جائے جو متبعین محمدؐ کی قیادت میں تمام انسانیت کو مژدۂ جانفزا سناتی ہو۔

ایک نئے قرآنی تصورِ حیات کی تشکیل جس کی بنیاد پر کوئی غلغلہ انگیز عالمگیر تحریک اٹھائی جاسکتی ہو گہرے اور سنجیدہ غور وفکر کے ساتھ ہی ہمہ جہت منصوبہ بندی کی بھی طالب ہے۔ لازم ہے کہ ہمارے بہترین دماغ، جنہیں بیک وقت جدید دنیا کی تفہیم بھی حاصل ہو اور جو قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کی کلیدی اہمیت سے آشنا ہوں، اپنی بہترین صلاحیتیں اس مقصد کے لئے صرف کردیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس نے عرب وعجم اور مشرق ومغرب میں خاصے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ مختلف زبانوں کے کوئی تین چار سو اعلیٰ دماغ اہل قلم بھی ہمارے رابطے میں آئے ہیں جو ایک نئی ابتداء کی ضرورت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ گزشتہ سات آٹھ برسوں کی قلمی اور فکری کاوشوں کے بعد شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ایک عالمگیر منصوبے اور غلغلہ انگیز علمی تحریک کے لئے مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالا جائے۔ ماضی میں بعض احباب کی طرف سے گاہے بہ گاہے اس خیال کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے کہ نئے مسلم

ذہن کی تشکیل کے لئے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بنیادی اہمیت کا حامل ہے جہاں قرآنی دائرۂ فکر میں جدید دنیا کے لئے اصحاب فن پیدا کئے جاسکیں۔ یہ فی نفسہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے بطن سے عالم اسلام کے لئے ایک نئی صبح طلوع ہوسکتی ہے۔ البتہ کسی ایسی دانش گاہ کے قیام سے پہلے ہمیں ماضی کے ان تجربات کو بھی اپنی نگاہوں میں مستحضر رکھنا ہوگا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ علی گڑھ اور دیوبند کے امتزاج کی جو کوشش ندوۃ العلماء کے قیام کا سبب بنی، وہ کسی نئی ابتداء کے بجائے پرانے طرزِ فکر کا توسیعہ بن کر رہ گئی اور شبلی نعمانی کو بالآخر پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

گزشتہ دنوں طالبان کے افغانستان پر امریکی فضائی حملوں کے درمیان بار بار یہ خیال کچوکے لگاتا رہا کہ جب تک ہماری دانش گاہیں B-52 بمبار طیارے کا جواب فراہم نہیں کرتیں، مغرب کے مقابلے میں ہزیمت اور پسپائی ہمارا مقدر رہے گی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں علوم وفنون پر مغرب کو واضح برتری حاصل ہے وہاں ایک امکانی رویہ اگر یہ ہوسکتا ہے کہ ہم علوم وفنون اور سائنسی ایجادات و اختراعات میں مغرب سے آگے نکلنے کی کوشش کریں تو وہیں ایک دوسرا ممکنہ عملی رویہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ علوم وفنون کی حامل قوموں کو اسلام کے عالمگیر مشن کے لئے مسخر کیا جائے۔ اسلام کی آفاقی دعوت کا اصل جوہر تو یہی ہے کہ وہ اپنے سخت ترین دشمنوں کے لئے بھی مژدۂ جانفزا بن جاتا ہے۔ عہد رسولؐ میں آفاقی اسلام کی اس دعوت نے مختلف قوموں اور ان کے اعلیٰ اصحاب علم وفن کو اسلام کی خدمت پر مامور کردیا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج مغرب کے پالیسی ساز اداروں اور مفکرین کو اسلام کی آفاقی دعوت اپنی اصل الاصل قالب میں متوجہ نہ کرسکے۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اسلام اور مسلمانوں پر اب کبھی صبح نہ آئے گی۔ لیکن وہی لوگ جو عباسی بغداد کی تاراجی کا سبب بنے تھے آنے والی صدیوں میں اسلام کے محافظ ونقیب بن گئے۔ عجب نہیں کہ ایک آفاقی اور پیمبرانہ لب ولہجہ کی تشکیل مغرب کے ایوانوں کو بھی اسی صورت حال سے دوچار کردے۔

اتنے بڑے چیلنج کے مقابلے کے لئے عالمی معیار کی ایک یونیورسٹی کا قیام اس منصوبہ کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہوسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سنجیدہ غور وفکر کے بعد خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔

